
تن تارا
رحیم گل

پھول' ملبہ اور معمار

رحیم گل اپنی ذات میں ایک فرد نہیں انجمن تھا۔ پختونوں کی روایتی وضعداری' مہمان نوازی' دوستی اور اصول پسندی کے گجرے میں فنکارانہ خوشبو کے کومل کومل پھول گوندھ کے اس نے اپنی شخصیت اور فن کو اتنا لطیف اور پُرکشش بنا لیا تھا کہ جو شخص بھی ایک مرتبہ اس کی کوئی تحریر پڑھ لیتا تھا یا اس سے مل لیتا تھا وہ اس کی شخصیت اور فن کے طلسم کا اسیر ہو جاتا تھا۔ وہ اُن ادیبوں میں سے تھا جن کی کوئی ایک تحریر پڑھنے کے بعد قارئین دیگر تحریروں کے متلاشی ہو جاتے ہیں۔ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ کہیں سے اس دلپذیر ادیب کی کوئی اور تحریر مل جائے۔ یہ خصوصیت اور امتیاز تاریخِ ادب میں بہت کم مصنّفوں کو حاصل ہُوا ہے۔ رحیم گل اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ادیب ہے کہ اس نے اپنی تحریری زندگی کے مختصر سے عرصے میں اپنے ہزاروں' لاکھوں مداحین اور پرستار پیدا کر لئے۔ اس کا تخلیق کردہ ادب اس لئے بھی عام ادب

سے مختلف ہے کہ وہ زندگی کے رس میں بھیگی ہوئی تحریروں کا خالق تھا۔ جھوٹ نہ اس کی زندگی میں تھا اور نہ اس کے فن میں۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو ایک ایسے یوٹوپیا تک پہنچا دیتا تھا جو ان کے خوابوں سے کہیں زیادہ سندر، واضح اور چمکیلا تھا۔

اس کی بے شمار کتابوں کو قبولِ عام کی جو سند حاصل ہوئی وہ ہمارے بے شمار ادیبوں کو جیتے جی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی کتابوں کے ہردلعزیز ہونے کا یہ عالم رہا کہ کئی کئی ایڈیشن بھی قارئین کی مانگ پوری نہیں کرسکتے تھے۔ بالخصوص "تن تارارا" کے ایڈیشنوں کی غیر معمولی اشاعت نے ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ جب تک ہم نے یہ کتاب نہیں پڑھی تھی یہی سوچتے تھے کہ لوگ "بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے" کے مصداق، بلا وجہ اس کتاب کے شیدائی اور پرستار بن گئے ہیں، لیکن جب اس کتاب کا مطالعہ کیا تو یہ حقیقت ہم پر منکشف ہوئی کہ لوگ ہی دراصل اصل کسوٹی ہیں اور وہ کسی کتاب کو بلا وجہ قبولیت کا شرف عطا نہیں کرتے۔ کتاب جب تک جاندار اور شاندار نہ ہو، کسی قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتی۔

کتاب کی کہانی دوسری جنگِ عظیم کے پس منظر سے طلوع ہوتی ہے، جب ایک جنگی قیدی ایک جاپانی قبائلی دوشیزہ کی پوتر محبت میں گرفتار ہوتا ہے۔ واقعات کا تانا بانا اتنی بے ساختگی اور فنکارانہ مہارت سے بُنا گیا ہے کہ صفحۂ اول سے لیکر صفحہ آخر تک قاری کتاب سے سر نہیں اٹھا سکتا۔ ہر لحہ بدلتے ہوئے واقعات کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے مصنف نے جس طرح ایک قبائلی دوشیزہ کے معصوم اور الہڑ جذبات محبت کی عکاسی کی ہے، وہ بے حد دلکش اور حد درجہ مؤثر ہے۔ پڑھتے پڑھتے قاری کو یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے وہ ایک ناول کے مفروضہ واقعات کا قاری نہیں ہے بلکہ حقیقی واقعات کا چشم دید گواہ ہے۔ قاری اور چشم دید گواہ میں جو فرق ہے اسے رحیم گل کے قلم کی سحر انگیزیوں نے ختم کر دیا ہے۔ یہ کام عام ادیب کا قلم نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے لئے غیر معمولی ادیب کے غیر معمولی قلم کی ضرورت تھی اور رحیم گل سے زیادہ مؤثر قلم کس کا تھا؟

"تن تارارا" سب سے پہلے اپنے نام کے اچھوتے پن کی وجہ سے قارئین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے۔ پھر وہ فضا قارئین کے رگ و پے میں اترنے لگتی ہے جس کا نقشہ رحیم گل نے کھینچا ہے۔ جوانی کی طغیانی کا جیسا بے ساختہ بیان اس کتاب میں ملتا ہے ویسی دلآویزی اور ویسی روانی اور کہیں نظر نہیں آتی۔

رحیم گل کہا کرتا تھا کہ لوگ بلاوجہ اس کی کومل اور لطیف احساسات میں گندھی ہوئی تحریروں میں فحاشی اور عریانی ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ بلاوجہ اسے عریاں نگار قرار دینے پر تل جاتے ہیں۔ حالانکہ دیانت داری سے دیکھا جائے تو ڈی.ایچ. لارنس اور موپاساں سے سعادت حسن منٹو اور سعادت حسن منٹو سے رحیم گل تک کہیں بھی دانستہ عریاں نگاری کی سعی نہیں کی گئی۔ مصنفین نے جو کچھ لکھا اس کا تقاضہ ہی یہی تھا۔ وہ جان بوجھ کر لوگوں کے سفلی جذبات برانگیختہ نہیں کرتے۔ اگر کسی کے جذبات بھڑکتے ہیں تو اس کے اپنے ذاتی خیالات اور ایک کمزور وژن کی غیر منطقی وسعت کی وجہ سے۔ غیر تربیت یافتہ، اَن کلچرڈ اور اَن سویلائزڈ سوچ کی وجہ سے۔ ذہن اگر پاک صاف خیالات کا محور ہے تو کسی گندی تحریر سے بھی کوئی غلط تاثر اخذ نہیں کر سکتا۔ ذہن ہی صاف نہ ہو تو پھر تلذذ کے لئے معمولی سی تحریر بھی شہوت انگیزی کا بہانہ بن سکتی ہے۔ لاہور میں منٹو اور ڈی.ایچ.لارنس پر فرانس میں فحش نگاری کے الزامات کے تحت جو مقدمے چلے اور ان کے وکلاء نے جو مؤقف اختیار کیا اس میں بنیادی نکتہ یہی تھا کہ سب سے پہلے فحاشی کی تعریف اور اس کی حدود کا تعین ضروری ہے، اس کے بعد ہی یہ

فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کس مصنف کی کون سی تحریر ان حدود کے تحت قابلِ گرفت ہے۔

رحیم گل اس لحاظ سے خوش قسمت ادیب تھا کہ اس کی کسی تحریر پر کوئی مقدمہ نہیں چلا۔ زبانی طور پر اس کی تحریروں میں عریانیت ڈھونڈنے والے کبھی ایسا مواد نہ تلاش کر سکے جن کی بنیاد پر اس کی گرفت کی جا سکتی اور اس کا احتساب یقینی بنایا جا سکتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ اس کی تخلیقات ایک صاف شفاف، صحت مند دماغ کی پیداوار تھیں اور صحت مند سوچیں رکھنے والے قارئین کے لئے تھیں۔ اس کے قارئین بیمار ذہنیت کے قارئین نہیں تھے اور نہ کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھے۔ یہی سبب ہے کہ سب سے پہلی پذیرائی اسے ملک بھر کے اعلیٰ ترین دانشور طبقوں سے ملی۔ پھر اس کی شہرت زینہ در زینہ سفر کرتی ہوئی عام قارئین تک پہنچی۔ وہ قارئین کی سیڑھیاں چڑھ کر دانشوروں تک نہیں پہنچا، بلکہ دانشوروں سے قبولِ عام کی سند حاصل کرنے کے بعد عام قارئین تک پہنچا۔ لہٰذا عوام و خواص دونوں طبقوں میں یکساں طور پر مقبول ہُوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مصنفین اپنی تحریروں کو چٹخارے دار بنانے کے لئے سیاق و سباق اور مقصد سے الگ ہٹ کر کچھ لُون مرچ ڈال دیتے ہیں۔ بالخصوص وہ مصنف تو ایسا کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں جن کی کتابیں قارئین میں ہاٹ کیک کی طرح فروخت ہوتی ہوں۔ لیکن رحیم گل کا شائستہ اور متین ذہن کبھی کمرشل انداز میں سوچنے پر مجبور نہیں ہوا، حالانکہ ضروریاتِ زندگی بھی اس کے سامنے تھیں، ڈیمانڈ بھی تھی، مقبولیت بھی تھی۔ چار پیسے کمانے کے مواقع بھی تھے لیکن اس نے ایسی روش اختیار کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ چاہتا ہی نہیں تھا کہ اپنی تحریروں کو اتنا ہلکا، اتنا سطحی، اتنا پوچ بنا دے کہ انہیں پڑھ کر خود اسے اپنے قلمکار ہونے میں تامل ہو۔

اس نے جو کچھ لکھا صدقِ دل اور دیانت داری سے لکھا۔ جو محسوس کیا اور لکھنا چاہا وہی لکھا۔ کسی دوسرے کی ہدایت قبول نہیں کی کیونکہ وہ خود ہدایت کار اور فلمساز رہ چکا تھا کسی اور کی ہدایت کیوں قبول کرتا۔

"تن تارارا" پڑھتے ہوئے ہم بار بار یہی سوچتے رہے کہ آخر اتنی اچھی کہانی پر اب تک کسی فلمساز کی نظر کیوں نہیں پڑی۔ اب تک "تن تارارا" نامی فلم کیوں نہیں بن سکی؟ جبکہ ہمارے فلمساز دن رات کہانیوں کی عدم دستیابی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ انہیں ملک بھر کے ادیبوں سے یہی شکایت رہتی ہے کہ وہ فلم انڈسٹری کا رخ نہیں کرتے اور اس گرتی ہوئی صنعت کو سہارا نہیں دیتے، تعاون نہیں کرتے۔ لیکن جب ہم رحیم گل کی فلمی زندگی کی مصروفیات کا جائزہ لیتے ہیں تو بے ساختہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ آخر ہماری فلم انڈسٹری نے رحیم گل کے ساتھ کیا تعاون کیا؟ کتنے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے اس کی تحریروں کا مطالعہ کیا اور کتنوں نے اس کے کسی ناول کو فلمانے کے لئے اس کی طرف دستِ تعاون دراز کیا؟ ظاہر ہے کہ ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔

رحیم گل ادب کے علاوہ فلمی صنعت کے مسائل کو بھی سمجھتا تھا۔ وہ کم سے کم بجٹ میں اچھے سے اچھا پروڈکشن رزلٹ دے سکتا تھا۔ اگر اسے مناسب تعاون حاصل ہوتا تو ضرور اس کی تخلیق کردہ فلمیں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیتیں۔ ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ اس نے ایک مرتبہ بھارت کے ایک مشہور فلم ساز کی پیش کش یہ کہہ کر رد کر دی تھی کہ اگر وہ فلم لکھے گا تو صرف اپنے ملک کے لئے لکھے گا۔ بھارت تو کجا، ہالی وڈ کا ہدایت کار یا فلم ساز بھی اس سے کہانی مانگے گا تو وہ صاف انکار کر دے گا۔ بلاشبہ رحیم گل کی حب الوطنی قابلِ

رشک تھی- قابلِ رشک ہے اور قابلِ رشک رہے گی- لیکن افسوس کا یہ مقام ہے کہ اس کی موت کو اتنے سال بیت گئے ہیں' اس کی کسی کہانی پر فلم بنانا تو درکنار' فلم انڈسٹری یا ادبی دنیا نے بھول کر بھی اس کی یاد کا کوئی دن نہیں منایا- فلمی اسٹوڈیوز میں چائے پہنچانے اور طبلے بجانے والوں کی یاد میں تو جلسے ہوتے ہیں- برسیاں منائی جاتی ہیں لیکن کبھی کسی فلمی یا غیر فلمی تنظیم کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ رحیم گل کی یاد کا بھی ایک دن مقرر کرے- اس کی قبر پر پھول چڑھائے- چراغ جلائے اور دنیا کو اس کے اچھے نام اور عمدہ کام سے آگاہ کرے-

شائد اپنے رفتگاں کو رسما" بھی یاد کرنے کی روایات دم توڑ چکی ہیں- اپنے پیاروں کے لئے دو آنسو بہانے' ان کی لحد پر دو پھول چڑھانے اور ایک چراغ جلانے کی بھی سکت ہم میں نہیں رہی- کیسے بے حس' بے ضمیر اور بے اصول ہیں ہم لوگ-

لیکن اس زوال پذیر معاشرے کی مٹتی ہوئی قدروں کے ملبے میں محترم سعید اے۔شیخ صاحب جیسے کچھ معمار اب تک زندہ ہیں جو بچھڑے ہوؤں کی متاعِ تخلیق' دنیائے ادب تک پہنچا کر ادبی دنیا کا قرض اپنے پلے سے ادا کر رہے ہیں- رابعہ بک ہاؤس کا یہ امتیاز' یہ اختصاص اسے بے شمار اداروں سے بلند پایۂ مقام عطا کرتا ہے- دیکھنا یہ ہے کہ رحیم گل کے نام کی شمع روشن رکھنے والے شیخ صاحب سے یہ معاشرہ کیا تعاون کرتا ہے......؟

اعتبار ساجد
98ء

یہ جگنوؤں کے دیس کی داستان ہے-

یہ بڑی دلدوز کہانی ہے' بڑا عجیب قصہ ہے-

جب میں اس زمانے کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے ایک خواب دیکھا تھا- میری عمر ہی کیا تھی اکیس بائیس کا سن----- مگر گاہے گاہے جب آنکھیں بند کر کے ان خوابوں کی دنیا میں لوٹ جاتا ہوں تو آنسوؤں کے اَن گنت چراغ جھلملا اٹھتے ہیں-

کئی برس بیتنے کے باوجود وہ یادیں مٹ نہ سکیں اور وہ دیئے بجھائے نہ بجھ سکے-

اُن دنوں دودھ پیتے بچے بھی چرچل کی "وی" کے معنی سمجھتے تھے- جس گلی سے گزرو' جس سڑک پر جاؤ' چھوٹے چھوٹے بچے' بیچ والی اور شہادت کی انگلی سے V بنا کر فتح کا سندیسہ دیتے- دیواروں پر لگے اشتہاروں پر' V؛ درختوں کے تنوں پر کٹی ہوئی "وی"- غرض اس "وی" نے مجھے ایسا جکڑ لیا کہ والدین کی

اجازت کے بغیر فوج میں بھرتی ہو گیا۔

میرے نقطہء نگاہ سے جنگ ایک کھیل تھا---- بڑے بڑے گولے چھوٹیں گے۔ ہوائی اور سمندری جہازوں پر بیٹھیں گے، دیس دیس کی سیر کریں گے۔ کسی لمحے ہم یہ کھیل جیت جائیں گے اور پھر سیٹیاں بجاتے لوٹ آئیں گے۔

لیکن سچ پوچھئے تو جنگ کا صحیح مقصد میری سمجھ میں اس وقت آیا جب میں جاپانی قیدی بن گیا اور ایک جاپانی سارجنٹ نے جنگ کے متعلق مجھ سے کچھ باتیں پوچھیں اور میں لاجواب ہو کر رہ گیا۔ اس نے کہا تھا۔

"تم مسلمان ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں"۔

کہنے لگا۔ "کیا اسلام خطرے میں ہے جو تم ہندوستانی فوج میں بھرتی ہو کر ہم سے لڑنے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "نہیں"۔

"تو پھر تم لڑنے کیوں آئے ہو؟"

میں خاموش رہا۔ جاپانی سارجنٹ کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں نفرت جھلکنے لگی۔ تم لوگ جنگ کے مقصد کو نہیں جانتے مگر لڑنے آئے ہو۔ تم ہندوستانی لوگ نہ ملک کے لئے لڑتے ہو، نہ ملت کے لئے۔ صرف پچیس روپے کے عوض فوجی وردی پہن کر ہماری گولی کا نشانہ بنتے ہو۔ لیکن ہماری گولی ایسی سستی نہیں کہ تم جیسے ناکارہ سپاہیوں پر ضائع کی جائے"۔

میں خاموش رہا لیکن دل میں سوچنے لگا---- ایک جاپانی گولی میری زندگی سے زیادہ قیمتی ہے۔ ایک غلام سپاہی کو لڑنے کا کیا حق ہے۔

جاپانی سارجنٹ پھر بڑبڑایا۔

"اب تم لوگ روتے ہو کہ جاپانی ہم پر سختی کرتے ہیں لیکن تم ہی بتاؤ جو شخص محض پچیس روپے کے عوض سکے کی گولی کے سامنے آتا ہے، اس سے ہم کیسا سلوک کریں گے؟"

جاپانی سارجنٹ کی باتیں بڑی عجیب تھیں۔ مجھے بری بھی لگیں اور نئی بھی۔

اب میں یہ سب باتیں بھول چکا ہوں، بھوک، پیاس، مار پیٹ تمام مصائب کی یادیں لوحِ دماغ سے مٹ چکی ہیں لیکن جگنوؤں کے دیس میں جو دیپ جلے تھے وہ روشن ہیں۔ میں جب بھی آنکھیں بند کر کے پلکوں سے پلکیں ملاتا ہوں تو ان دیپوں کو اسی طرح ٹمٹماتے دیکھتا ہوں۔ شاید کاتبِ تقدیر میرے حصے کی روشنی مجھے دے کر ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔

جاپانی سارجنٹ کی باتوں پر چند لمحے غور کرنے کے بعد مَیں پھر اپنی سوچوں میں کھو گیا---- کیا ہم کسی طرح یہاں سے فرار ہو سکیں گے؟ ان دنوں ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ کس طرح جاپانی قید سے رہائی مل سکتی ہے---- اس سے پہلے بھی چار چار پانچ پانچ کی ٹولیاں فرار ہو چکی تھیں---- ایک دو پکڑی بھی گئیں لیکن کچھ ٹولیوں کا بالکل پتا نہ چلا۔ جانے راہ میں مر کھپ گئیں یا ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔ لیکن نہ پکڑے جانے کا مطلب قیدیوں میں یہی لیا جاتا تھا کہ وہ جاپانی سرحد پار کر گئے ہیں۔

آخر میں نے اپنے دو تین ہم عمر ساتھیوں کو تیار کر لیا۔ ایسے اقدام کے لئے احتیاط اور راز داری کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا اقرار و پیمان کئے گئے، قسمیں کھائی گئیں اور مکمل اعتماد اور راز داری کے ساتھ ایک ماہ کی جدوجہد کے

بعد ہم تار کاٹنے میں کامیاب ہو گئے۔ کیمپ سے دو تین فرلانگ جا کر ہی ہمیں ایسا محسوس ہُوا جیسے ہم ہندوستان کی سرحد پر قدم رکھ چکے ہیں۔ بچے ہوئے پنچھی کے جیسے پر نکل آئے ہوں۔ ہم دوڑے جا رہے تھے بھاگے جا رہے تھے نا معلوم سمت اور نا معلوم منزل کی طرف۔

یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ صبح ہوتے ہی ہمارے فرار کی اطلاع جاپانی چوکیوں میں پہنچ جائے گی۔ پکڑے گئے تو موت کے سوا دوسری بات نہ ہو گی۔ سردیوں کے دن تھے، ہم رات بھر بھاگتے رہے۔ صبح پو پھٹنے پر معلوم ہُوا کہ ابھی ہم خطرے کی حدود سے باہر نہیں ہوئے۔ چاروں طرف دھان کے کھیت تھے ان میں ٹخنے ٹخنے پانی تھا۔ کہیں کہیں کیلوں کے جھنڈ تھے۔ ان کے علاوہ حدِ نظر تک نہ کہیں پہاڑی تھی نہ ٹیلا۔

دن میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا، اس لئے طے ہُوا کہ جب تک اندھیرا نہ ہو جائے، دھان کے کھیتوں میں دن گزارا جائے۔ پھٹی پرانی وردی جو ہم پہنے ہوئے تھے، اس کے علاوہ ایک ایک کمبل ہماری کُل کائنات تھی۔۔۔۔۔

پورا دن پانی میں اکڑوں بیٹھے رہے اور اندھیرا ہونے کے لئے خدا سے دعائیں مانگتے رہے۔

بلونت سنگھ کو سردی لگ رہی تھی اور وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ کہنے کو تو وہ سکھ تھا لیکن تھا بہت نازک مزاج۔ میٹرک میں پڑھ رہا تھا کہ فوج میں کلرک بھرتی ہو گیا اور چھ مہینے بعد جاپانی قیدی بن گیا۔۔۔۔ بال کھولتا تو بالکل لڑکیوں کی طرح لگتا۔ ابھی تک اس کی مَسیں نہیں بھیگی تھیں۔

مَیں اور مہردین مسلمان تھے۔ کمل رام گڑ گاؤں کا جاٹ تھا۔ بلونت لدھیانے کا تھا۔ ہم چاروں میں بڑی محبت تھی۔ شروع میں مَیں اور بلونت ہی راز دار تھے۔ بعد میں کمل رام اور مہردین کو بھی ہم نے اعتماد میں لے لیا اور ایک مہینے تک ہم بھاگنے کی سکیمیں سوچتے رہے۔

دن میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا اور شام ہو گئی۔ تھوڑی دیر بحث کے بعد کسی ایک سمت کو جانے پر اتفاق ہو گیا، مگر ہم ایک آدھ میل ہی گئے ہوں گے کہ بلونت سنگھ گر پڑا۔ ہم لپک کر اس کے پاس پہنچے۔ سارا دن پانی میں رہنے کی وجہ سے اسے ٹھنڈ لگ گئی تھی۔ ہم تینوں اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئے۔ مہر دین نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بلونت سنگھ نے آنکھیں کھولیں۔

"آپاں تا رہ گئے دوستو"۔

"نہیں نہیں ہم تمہیں ساتھ لے چلیں گے بلونت"۔ ہم تینوں نے ایک ساتھ کہا مگر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تُسی لوک جاؤ۔ آپاں دے نصیباں نے ساتھ نہیں دتا"۔ (تم لوگ جاؤ میرے نصیب نے میرا ساتھ نہیں دیا۔)

اور اس کے انکار کے باوجود ہم نے اسے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم باری باری اسے اٹھاتے رہے۔ گھڑی کسی کے پاس نہیں تھی۔ لیکن اندازاً" رات کے گیارہ کا سمے ہو گا، بلونت نیم بے ہوش تھا۔

کمل رام بولا۔ "اس کی حالت تو بہت خراب ہو گئی ہے"۔ وہی اسے اٹھائے ہوئے تھا۔

میں اور مہردین ٹھہر گئے۔ کمل رام نے اسے آہستگی سے اتارا اور اپنی گود میں اس کا سر رکھ کر لٹا دیا۔ مَیں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے جھنجھوڑا۔

"بلونت، آنکھیں کھولو بلونت"۔

بلونت نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے ہم تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"بس سجنو الوداع"۔

مہردین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اس سے لپٹ گیا۔ کمل رام چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی یہ خاموشی بلونت کی موت سے زیادہ بھیانک تھی۔ خود میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ بلونت میرا ساتھی تھا۔ ہم ایک رجمنٹ میں ایک ساتھ آئے تھے۔ اکٹھے جنگ پر آئے اور اکٹھے قیدی بنے۔ پھر آج اس کی منزل مجھ سے الگ کیوں ہو گئی۔

"بلونت! بلونت سنگھ"۔ میں نے اسے جھنجھوڑا اور جواب نہ پا کر اور زیادہ جذباتی ہو گیا۔

"بلونت۔ تو نے کہا تھا کہ لدھیانے میں تو مجھے پورا ایک ماہ اپنے گھر رکھے گا اور پھر اتنا ہی عرصہ میرے ساتھ میرے گھر رہے گا۔ بلونت' لیکن تُو نے تو یہیں ساتھ چھوڑ دیا۔ ابھی تو منزل کا نشان بھی نہیں ملا تھا اور تو بچھڑ گیا۔ یہ تُو نے کیا کیا بلونت۔ یہ تُو نے کیا کیا"۔

کمل رام نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس جاٹ کے ہاتھ میں صبر اور تسلی کی تلقین تھی۔ "آؤ اس کے لئے گڑھا کھودیں"۔

لیکن ابھی بدنصیبی نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ صبح کا سورج طلوع ہو رہا تھا کہ اچانک ایک جاپانی گشتی دستے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

ایک لمحے کے لئے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کمل رام اور مہردین دونوں پیچھے کو بھاگے۔ میں وہیں دھان کے کھیت میں لیٹ گیا۔

دستے کے انچارج نے نشانہ باندھ کر للکارا۔ "کھڑے ہو جاؤ۔ کھڑے ہو جاؤ"۔

لیکن وہ دونوں نہ رکے۔ کمانڈر نے فائر کر دیا۔ گولی مہردین کی پیٹھ میں لگی اور وہ بل کھا کر گر پڑا۔ کمل رام دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ میں رینگتے رینگتے کھیت کے دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔ سخت سردی کے باوجود میری پیشانی پسینے سے تر تھی۔

مہردین ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ دو جاپانی سپاہی رائفل تانے کمل رام کی طرف آئے۔ دونوں نے لاش پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر اپنی سنگینیں کمل رام کی چھاتی پر رکھ دیں---- کمل رام اسی طرح ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑا تھا۔ ایک سپاہی نے سنگین کی نوک اس کی چھاتی پر دبا کر پوچھا۔

"کتنے آدمی تھے تم لوگ؟"

"دو----! بس ہم دو"۔ کمل رام نے جواب دیا۔

"جھوٹ بالکل جھوٹ"۔ جاپانی سپاہیوں نے لبلبی پر انگلی رکھ دی۔

"کدھر گیا ہے باقی آدمی ہم تم کو شوٹ کرے گا۔ ہم کو چار کا خبر ملا ہے"۔

"ہاں ہاں تم ٹھیک کہتا ہے"۔ کمل رام نے تائید کی۔ "دو آدمی پیچھے رہ گیا ہے"۔

"کدھر رہ گیا ہے؟ ہم تم کو گولی مار دے گا"۔

"وہ دونوں پیچھے مر گیا ہے' سخت سردی تھا"۔

"جھوٹ بولتا ہے۔ ہم تم کو شوٹ کرتا ہے"۔

ایک سپاہی نے پیچھے ہو کر اس پر شست باندھی۔ کمل رام نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

"وہ دیکھو' ہم جھوٹ نہیں بولتا۔ ہم تم کو لاش دکھائے گا"۔

"اچھا۔ ہم تم کو چھوڑتا ہے۔ ہم لاش دیکھے گا اور جھوٹ بولا تو مارا جائے گا"۔

وہ کمل رام کو ساتھ لے گئے۔ میں وہیں دبکا رہا۔۔۔ نہ جانے بعد میں ایک لاش پا کر جاپانی سپاہیوں نے اس کی کیا درگت بنائی ہو گی۔ لیکن کمل رام نے اپنی جان پر کھیل کر میری جان بچا لی تھی۔

سامنے مہردین کی لاش پڑی تھی۔ میں پانی میں اکڑوں بیٹھا کانپ رہا تھا۔ بلونت سنگھ بتّیس میل پیچھے دھرتی کی ٹھنڈی آغوش میں ابدی نیند سو رہا تھا۔ کمل رام جاپانی چوکی کی کسی کال کوٹھڑی میں پڑا ہو گا۔ دھان کے لہلہاتے پودے میری ناک' کان اور آنکھوں میں گھسے جا رہے تھے۔

سورج ڈوبنے کو آ گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار شفق کی خوبصورتی کو بڑے غور سے دیکھا۔ مجھے ہر لحہ اندھیرا ہونے کا انتظار تھا۔ اجالے نے مجھ سے دو ساتھی چھین لئے تھے۔ اب میں اکیلا تھا اور اس اکیلے پن کا مجھے شدید احساس تھا۔

چاروں سمت اندھیرا چھا گیا۔ میں دھیرے دھیرے اور بے حد محتاط اندازے سے باہر نکلا۔ دائیں بائیں دیکھا۔ تاریکی نے میرے لئے اپنی آغوش وا کر دی تھی۔ کمل رام کا خیال آیا تو ایک بار پھر میرا دل اس جاٹ کے لئے عقیدت و احترام کے جذبات سے بھر گیا۔ آنسو پلکوں پر آ کر رک گئے۔ سوچا۔۔۔ کیوں نہ کمل رام کا ساتھ دوں۔ اسے موت کے منہ میں تنہا چھوڑ دینا تو بے انصافی ہو گی۔۔۔۔ پھر معاً ایک اور خیال آیا۔ ایسا تو کمل رام بھی کر سکتا تھا مگر اس نے نہیں کیا۔ اس طرح تو اس کے ایثار کی توہین ہو جائے گی۔ اس کی آتما کو دکھ پہنچے گا۔ سوچتے سوچتے غیر ارادی طور پر میں مہردین کی لاش تک پہنچ گیا۔ لاش اکڑ کر تختہ بن گئی تھی۔ تاریک رات میں لاشوں سے وابستہ روایات کا تصور کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

مہردین کہا کرتا تھا۔۔۔۔ "اسد بھائی' ہندوستان پہنچ کر سب سے پہلے تاج محل دیکھیں گے۔ پھر دہلی کا لال قلعہ' موتی مسجد اور قطب مینار دیکھنے جائیں گے۔ سنا ہے اوپر چڑھ کر جمنا سفید چمکتی ہوئی لکیر کی مانند دکھائی دیتی ہے۔۔۔۔۔ اور لاہور میں تو پورے تین دن ٹھہریں گے۔ جہانگیر کا مقبرہ' انار کلی' شالا مار باغ سب کی جی بھر کر سیر کریں گے۔ اس کے بعد گھر جائیں گے' پہلے میرے گاؤں پھر تمہارے گاؤں۔ اور ہاں۔۔۔۔ یہ بھاگنے واگنے کی ساری داستان تم سناؤ گے۔ تم مرچ مسالا لگا کر بات کرنے کے عادی ہو نا"۔

میں نے ڈرتے ڈرتے مہردین کے ٹھنڈے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"اچھا دوست' میں تیرے گھر ضرور جاؤں گا۔ مگر اتنا تو بتا دے کہ کیا تیری موت کی جان گسل خبر پہنچانا میرے ہی مقدر میں لکھا تھا؟ یہ کتنی المناک ذمہ داری ہو گی۔ کتنا ناگوار فرض ہو گا۔۔۔۔ مگر مہردین میں تیرے گھر جاؤں گا ضرور۔ تاکہ تیری ماں کی آنکھوں کا انتظار چھین کر اس کی پلکوں میں صبر کے موتی پرو سکوں اور تیری جوان بہن کے کنوارے آنسوؤں سے کہہ سکوں کہ لے۔۔۔۔ یہ تیرے بیاہ کا سرخ جوڑا تیرے بھائی نے بھیجا ہے"۔

اندھیرا بہت بڑھ گیا تھا۔۔۔۔ میں نے مہردین کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

"اچھا دوست الوداع"۔

گزشتہ شام شفق کی سرخی نے مجھے ایک تاثر دیا تھا۔۔۔۔ آج میں نے زندگی کی سب سے خوبصورت صبح دیکھی۔۔۔ نہ سنگی نہ ساتھی' نہ ٹھور نہ

ٹھکانا۔۔۔۔ پھر بھی پونچھنے کا منظر بے حد دلفریب اور مسرت بخش تھا۔ وقتی طور پر سہی مگر میں محظوظ ہُوا۔ شاید اس خوشی میں یہ احساس بھی شامل ہو کہ میں جاپانی سرحد سے بہت دور نکل آیا تھا۔۔۔۔۔۔

اب میرے سامنے ایک گھنا جنگل تھا اور داہنے ہاتھ اونچے اونچے پہاڑ۔ سوچا اگر اس پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ جاؤں تو شاید کہیں آبادی کا نشان مل جائے۔ اس بات کا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ جاپانی گشتی پارٹیاں اس طرف کا رخ نہیں کر سکتیں۔

میں پہاڑوں میں گھوم پھر چکا تھا اس لئے پہاڑ پر چڑھنے میں دشواری پیش نہ آئی۔ ایک جگہ کھٹے اناروں کے پیڑ نظر آئے' جو زیادہ پک جانے کی وجہ سے پھٹ گئے تھے۔ سرخ سرخ دانے دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔

راشن کے بسکٹ جو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے بچائے تھے' کمل رام کے جھولے میں رہ گئے تھے۔ گویا میں دو دن سے بھوکا تھا اس لئے انار بہت اچھے لگے۔

معاً" میرے کانوں میں کسی عورت کے گنگنانے کی آواز آئی۔ میں چونک اٹھا۔ دائیں بائیں دیکھا' کچھ بھی نظر نہ آیا۔ گنگناہٹ دھیرے دھیرے پتوں کی سرسراہٹ میں تحلیل ہو گئی۔۔۔ میں نے سوچا ممکن ہے کسی جنگلی پرندے کی آواز ہو اس لئے اُدھر کا خیال چھوڑ کر میں پھر انار کھانے میں لگ گیا۔ مگر ابھی مشکل سے دو ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک ایک نسوانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہے"۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ پہلی نظر میں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ خوف کی وجہ سے

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ آواز پھر آئی۔

"ہے"۔

اب کی آواز کے ساتھ ہی میری نظریں ایک پیڑ پر جم گئیں۔

ایک نوجوان لڑکی شاخ پر بیٹھی انار کھا رہی تھی اور مجھے عجیب سی نظروں سے گھور رہی تھی۔ اس کا لباس میرے لئے بالکل نیا تھا۔

اس نے بے نیازی سے انار کے کچھ دانے منہ میں ڈالے اور پھر نیچے اتر آئی۔ میں نے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

چھوٹے چھوٹے خشک اور الجھے ہوئے سیاہ بال۔ سولہ برس کا سن' کھلتا ہُوا گورا رنگ' ناک نقشہ بے حد سبک اور سجل۔۔۔ آنکھیں قدرے چھوٹی لیکن نہایت ہی چمک دار اور پُر اثر۔۔۔ انتہائی تندرست' چھریرا اور سڈول جسم' گلے میں نیلے منکوں کا ہار' کلائی اور بازوؤں میں دھاگے میں پروئے ہوئے رنگ برنگ کے منکے بندھے ہوئے۔ وہ چیتے کی کھال کا بنا ہُوا نیم برہنہ لباس پہنے تھی۔ ننگے بازو' ننگی پنڈلیاں اور ننگا پیٹ۔

"ساتی رو"۔ چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے مجھے پکارا۔ مَیں خاموش کھڑا رہا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

"ساتی رو۔۔۔!" وہ پھر بولی۔

"ساتی رو" مَیں نے زیرِ لب دہرایا۔۔۔۔ اور اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میری نگاہیں اسی طرح اس حسین اور دلکش لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بھی مستفسرانہ انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"ساتی رو۔۔۔۔۔!"

مَیں نے نفی میں سرہلایا۔ اور ہاتھ کے اشارے سے اسے سمجھایا کہ میں

تمہارا مطلب نہیں سمجھ رہا۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ اس کے سرخ سرخ مسوڑھوں میں سفید دانت چمکنے لگے۔ اس کی ہنسی پہاڑی آبشار کی طرح دلکش تھی۔

"ساتی رو"۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ ساتی رو کا مطلب اب میری سمجھ میں آگیا تھا۔ میں حیرت' تجسس اور شوق کے ملے جلے جذبات سے چپ چاپ اس کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ اب میرے اور اس کے درمیان صرف دو قدم کا فاصلہ تھا۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔

وہ جاپانی نہیں تھی' چینی نہیں تھی۔ ملائی اور انڈونیشی بھی نہیں تھی۔ وہ کوئی اور ہی مخلوق تھی۔ مگر وہ کوئی بھی تھی' مجھے اس سے ذرہ بھر خطرہ محسوس نہیں ہُوا۔

اس کی ٹکٹکی کو دیکھ کر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ وہ بھی مسکرا دی۔

"نی تارا مائی جا"۔ اس کے ان الفاظ میں بڑی لگاوٹ اور مٹھاس تھی۔

جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس نے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر پیچھے کی طرف دیکھا اور زور سے چلائی۔

"بام چانگاں ماں۔۔۔۔ بام چانگا ماں"۔

پھر اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور ہنس پڑی۔ اس کی آواز کی باز گشت پہاڑ کے چاروں طرف گونج اٹھی۔ یہ گونج ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ مختلف سمتوں سے مختلف آوازوں نے مجھے حیران کر دیا۔

"ری آئی را۔ ری آئی را۔ ری آئی را"۔

سب نسوانی آوازیں تھیں۔ سب کا جواب ایک جیسا تھا۔۔۔ دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ مختلف سمتوں سے بید کی ٹوکریاں اٹھائے ہوئے سات آٹھ لڑکیاں ہمارے اِردگرد جمع ہو گئیں۔ سب کی ٹوکریوں میں کھٹے انار تھے۔ سب کے لباس ایک جیسے تھے اور ساری جوان تھیں۔

وہ لڑکی بدستور ہنس رہی تھی۔ اس نے اپنی زبان میں انہیں کچھ بتایا۔ لڑکیوں کی حیرت اب مسکراہٹ میں بدل گئی تھی اور وہ بڑے شوق سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

اس الجھے بالوں والی لڑکی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بہت خوش ہے اور اپنی سہیلیوں کو کسی آخری فیصلے تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اتنا اندازہ مجھے ہو گیا تھا کہ نزدیک ہی کہیں آبادی ہے اور یہ لڑکیاں یہاں انار توڑنے آئی ہیں۔

سب لڑکیاں سوالیہ انداز میں میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔۔۔ پھر وہی لڑکی میرے قریب آ کر بولی۔ "ری"۔

مَیں نے ایک لمحہ اس کی طرف دیکھا پھر دوسری لڑکیوں کی طرف۔۔۔۔۔ جواب نہ دے سکنے کی بے بسی میرے چہرے سے عیاں تھی۔

لڑکی پھر بولی۔ "ری"۔

"ری"۔ میں نے بھی اس لفظ کو دہرایا اور ہاتھ کے اشارے سے نہ سمجھنے کی مجبوری کا اظہار کیا۔۔۔ وہ سب ہنس پڑیں۔ اب کی وہ لڑکی بھی ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "ری"۔

غالباً" وہ ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھی۔ میں نے بھی کہا۔"ری"۔اور ان کے ساتھ چل پڑا۔

پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر سب ایک لمحے کے لئے رک گئیں اور ایک لڑکی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے نیچے وادی کی طرف متوجہ کیا---- دور دور تک سیاہ جنگل دکھائی دے رہا تھا--- درمیان میں دس بارہ میل کا احاطہ صاف تھا' جس میں میل آدھ آدھ میل کے فاصلے پر چھ سات بستیاں نظر آ رہی تھیں۔

یہ دراصل ان جنگلی لوگوں کی بستیاں تھیں جو بیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی مہذب دنیا سے الگ تھلگ اپنی دنیا آباد کئے ہوئے تھے۔ میں وثوق سے تو اب بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایشیا کا کون سا علاقہ تھا۔ ہاں اتنا اندازہ ضرور ہے کہ یہ چین کی سرحد سے کچھ فاصلے پر سلسلہء کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع تھا کیونکہ بعد کے واقعات سے یہی ثابت ہُوا۔

لڑکیاں جنگلی ہرنیوں کی طرح چھلانگیں مارتی ہوئی اتر رہی تھیں۔میں گو پہاڑوں سے مانوس تھا---- مگر اترائی میں خود کو ان جیسا متوازن نہیں رکھ سکتا تھا۔ لہٰذا بڑی آہستگی سے' سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا--- وہ مڑ کر دیکھتیں اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔

الجھے ہوئے بالوں والی جوگن لپک کر آئی اور سہارے کے لئے اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب وہ کھینچ کھینچ کر مجھے نیچے اتار رہی تھی----- لڑکیاں مڑ مڑ کر دیکھتیں' تالیاں بجاتیں' خوش ہوتیں اور پھر اترنے لگتیں۔

وہ لڑکی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔ اسے جانے کیا شرارت سوجھی کہ میرا ہاتھ کھینچتی چھوٹے چھوٹے قدموں سے ڈھلان پر دوڑنے لگی۔ قریب تھا کہ میں اپنا توازن کھو کر منہ کے بل گر پڑتا کہ میں نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ میرے غیر متوقع بوجھ سے وہ بھی لڑکھڑا گئی مگر لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے اس نے ایک درخت کی شاخ پکڑ لی اور رک گئی۔

ایک نوجوان لڑکی کو اس طرح بازوؤں میں لے لینے سے جہاں میرا رؤاں رؤاں جاگ اٹھا تھا وہاں ایک مبہم سے خوف نے مجھے سہا بھی دیا تھا۔ میں ہانپ رہا تھا۔ میری اس کیفیت کو دیکھ کر لڑکی کی ہنسی آبشار کی طرح پھیل گئی۔

باقی لڑکیاں بھی اپنی اپنی جگہ رک گئی تھیں اور بے تحاشا ہنس رہی تھیں۔ وہ بھی برابر ہنسے جا رہی تھی---- میرے لئے حیران کن امر یہ تھا کہ میری مردانہ گرفت کا کوئی رد عمل اس کے چہرے پر نہیں تھا۔

پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر لڑکیاں رک گئیں۔ سرگوشی سی ہوئی' پھر سب نے ایک ساتھ ہاتھ اٹھائے اور بھونپو بنا کر زور سے چلائیں۔

"بام چانگا ماں۔ بام چانگا ماں"۔

ان کی آواز ساری وادی میں پھیل گئی۔ انہوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھا سب خوش تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔ بستیوں کی جانب سے ان گنت بچے' لڑکے اور لڑکیاں ہماری طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ لوگ ہمارے قریب پہنچ گئے۔ وہ سب بہت خوش تھے۔ تالیاں بجا بجا کر انہوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں خطرے میں نہیں ہوں۔ پھر بھی یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا اور میں حیرت کے ساتھ ساتھ کسی حد تک خوف زدہ بھی ہو رہا تھا--- وہ لڑکی بدستور میرا ہاتھ تھامے ہنس ہنس کر اپنی زبان میں انہیں کچھ سمجھا رہی تھی۔

ان سب کا لباس تقریباً" ایک جیسا تھا۔ کسی جانور کی کھال کا لنگوٹ اور باقی جسم ننگا--- یہ مردوں کا لباس تھا۔ البتہ عورتوں کا اوپر کا دھڑ آدھا ڈھکا ہُوا تھا۔ مردوں کے پاس نیزے اور برچھے تھے۔

لڑکی نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور پھر زور سے اپنی زبان میں کچھ

بولی ـــــ سب نے خوشی کا نعرہ لگایا اور آبادی کی طرف چل پڑے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے جلوس میں اضافہ ہوتا گیا۔ تالیوں کا شور اور برچھیوں کی چمک بھی بڑھتی گئی۔ میں خود کو کوئی عجوبہ سا محسوس کرنے لگا۔

ہم پہلی بستی کے قریب پہنچے تو ہمارے استقبال کے لئے بوڑھی عورتیں اور مرد بھی کھڑے تھے۔ یہ لوگ بھی مسکرا رہے تھے۔ ان سب کی ہنسی میں نہ تو کوئی طنز کا پہلو تھا اور نہ کسی قسم کی درندگی کا احساس۔

پھر چلتے چلتے معاً سب لوگ رک گئے اور مؤدبانہ انداز میں جھک گئے۔ تالیوں کی گونج اور شور و غل بھی سرد پڑ گیا تھا۔ جس لڑکی نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا اس نے ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی نظریں نیچی اور گردن خم کئے کھڑی تھی ـــــ میں نے سامنے دیکھا۔ چیتے کی کھال کی لنگوٹ پہنے اور گلے میں موتیوں کی مالا ڈالے بیس بائیس برس کا وجیہہ نوجوان ہماری طرف آ رہا تھا۔ مجمع نے فوراً اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

نوجوان میرے اور لڑکی کے قریب آ کر رک گیا۔ بھرپور نگاہ لڑکی پر ڈالی پھر میری طرف دیکھا۔ وہ بڑی متانت سے مسکرا رہا تھا۔

پھر وہ مجھے مخاطب کر کے کچھ بولا جسے میں نہ سمجھ سکا۔ مجھے خاموش پا کر لڑکی نے اسے کچھ جواب دیا۔ باقی سب لوگ خاموش سر جھکائے کھڑے تھے۔ لڑکی سے ایک دو باتیں کر کے وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ ایک قدم آگے بڑھا اور بڑی اپنائیت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"سنگتا سنگتا"۔

اس پر سارے لوگوں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں ـــــ اور سب کے سب ہنسنے ناچنے لگے۔ لڑکی نے پھر سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ نوجوان جا چکا تھا۔

میں سوچنے لگا ـــــ یہ کون تھا؟ بلا شبہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا اور لوگ باگ بھی آ گئے تھے اور اب ہمارا جلوس ڈیڑھ دو سو آدمیوں سے کم نہ تھا۔

دو بستیاں چھوڑ کر تیسری بستی میں پہنچے تو لڑکی نے رک کر میری طرف دیکھا۔ میں بھی رک گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور بولی۔

"ناں ری پا۔ ناں ری پا"۔

سب لوگ رک گئے اور پھر ہنستے مسکراتے خوش خوش ادھر ادھر چلے گئے۔ لڑکی نے دوبارہ میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"ری"۔

میں اس کے ساتھ چل پڑا ـــــ لکڑی کے بنے ہوئے گول گول گھر اور اس پر گھاس پھوس کی ترچھی چھتیں۔ تقریباً سب گھر ایک جیسے تھے۔ جلوس کی شکل تو اب ختم ہو گئی تھی۔ مگر ہم گاؤں کے جس گھر کے پاس سے گزرے سبھی ہمیں مسکرا مسکرا کر دیکھتے تھے۔

کوئی ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد لڑکی نے میرا بازو دبایا اور ایک گھر کی طرف اشارہ کر کے کچھ بولی۔ میں اپنے اندازے سے سمجھا کہ یہی اس کا گھر ہے۔ پچاس پچپن کے لگ بھگ کا ایک آدمی اور تقریباً اسی عمر کی ایک عورت صحن میں کھڑے اشتیاق بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ لڑکی میرا ہاتھ چھوڑ کر ان کی طرف دوڑی اور اچھل اچھل کر دونوں کو کچھ سمجھاتی رہی ـــــ میں چھ سات قدم کے فاصلے پر چپ چاپ کھڑا رہا ـــــ غالباً یہ اس کے ماں باپ تھے۔ وہ دونوں مجھے حیران مگر پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لڑکی کے کہنے پر دونوں میرے قریب آ گئے۔ لڑکی کے خد و خال اس

عورت سے بہت ملتے تھے۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ عورت اس کی ماں اور یہ آدمی اس کا باپ ہے اور وہ مجھے اپنے گھر لے آئی ہے۔ جانے وہ کیا بولی۔۔۔۔ کہ اس آدمی نے بڑھ کر میرے شانے تھپتھپائے۔

اس سلوک سے میری تسلی اور اطمینان میں کچھ اضافہ ہو گیا۔

ان کا گھر تین جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔ ایک جھونپڑا الگ تھا اور دو ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ اس کی ماں نے لڑکی سے کچھ کہا۔۔۔۔ اور دوسرے لمحے وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک جھونپڑے میں لے گئی۔

میں نے اس گول جھونپڑے کو بڑے غور سے دیکھا۔ فرش پر سوکھی گھاس بچھی ہوئی تھی۔ گھاس کی چھت میں دو برچھیاں اٹکی ہوئی تھیں اور لکڑی کی مختلف کھونٹیوں پر جانوروں کی کھالیں لٹکی ہوئی تھیں۔

لڑکی نے ایک کھونٹی پر سے چیتے کی کھال کا بنا ہُوا ایک لنگوٹ اتارا۔ اسے اِدھر اُدھر سے دیکھا اور پھر ہنس کر میری طرف بڑھایا۔

"پائی را"۔

"پائی را" کا مطلب میں فوراً سمجھ گیا۔ وہ اسے پہننے کے لئے کہہ رہی تھی۔

میں نے لنگوٹ کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور پھر مسکرا کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ کھٹ کھٹ کرتی باہر چلی گئی۔

میں نے اپنی پھٹی ہوئی وردی کی طرف دیکھا اور لنگوٹ کو بھی۔ سچ مچ اس لمحے مجھے اس لنگوٹ کو پہنتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے لپک کر جھونپڑے کا بانسوں کا بنا ہُوا دروازہ بند کر دیا۔

لنگوٹ باندھ کر جب میں نے اپنا جائزہ لیا تو کچھ عجیب سا لگا۔ زندگی میں پہلی بار لنگوٹ باندھ کر میں دوسروں کے سامنے جا رہا تھا مگر اس احساس میں حجاب کا کوئی پہلو نہیں تھا' بلکہ اپنے تنے ہوئے ورزشی جسم کی نمائش کا ایک اوچھا سا جذبہ محسوس کر رہا تھا۔

باہر۔۔۔۔ وہ سب منتظر کھڑے تھے۔

لڑکی نے خوشی اور فخر سے اپنے ماں باپ کی طرف دیکھا اور پھر بے ساختہ ہنس پڑی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ دونوں بھی مسکرا رہے تھے۔۔۔۔ دونوں کی مسکراہٹ میں ممتا اور شفقت تھی۔

شام کو کھانے میں مجھے شہد اور مکئی کی روٹی دی گئی تھی۔ جاپانی قید میں اُبلے ہوئے چاول ملتے تھے۔ وہ بھی اس مقدار میں کہ بس زندہ رہا جا سکے۔ اس لئے مکئی کی روٹی اور شہد میرے لئے نعمتِ عظمیٰ سے کم نہ تھے۔ سونے کے لئے الگ جھونپڑا میرے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ بید کی چٹائی اور لومڑی کی کھال کا باریک اور نرم پروں سے بھرا ہُوا تکیہ دیا گیا۔ روشنی کے لئے وہ لوگ بید کی طرح باریک شاخوں والی لکڑی کا ایک سرا جلا دیا کرتے تھے۔ اس لکڑی میں کچھ ایسی خاصیت تھی کہ یہ دیئے کی لَو کی طرح آہستہ آہستہ جلتی تھی۔ چھوٹے سے جھونپڑے میں اس سے کافی روشنی ہو جاتی تھی۔

قید میں مَیں زمین پر سونے کا عادی ہو گیا تھا۔۔۔۔ یہاں زمین پر گھاس بچھی تھی اور اس پر بید کی چٹائی اور گرم نرم تکیہ۔ اس لئے مَیں جلد ہی میٹھی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

اور پھر مَیں نے ایک بڑا سہانا سپنا دیکھا۔ جیسے کوئی میرے پاؤں کو دھیرے دھیرے سہلا رہا ہو اور ان پر اپنے رخسار مَل رہا ہو اور چوم رہا ہو۔

یہ بے حد سکھ اور چین کی رات تھی۔

صبح وہ میرے لئے گرم گرم دودھ لائی- اور پھر دیر تک چڑیوں کی چہکار کی سمجھ میں نہ آنے والی بولیاں بولتی رہی- میں مسکراتا رہا---- یہ بے حد طلسمی اور حسین صبح تھی-

تھوڑی دیر بعد اس کی ماں آ گئی اور باپ بھی- مَیں دودھ پی چکا تھا- ان تینوں نے آپس میں کچھ گفتگو کی جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے کہیں لے جانا چاہتے ہیں- لڑکی نے مجھے اشاروں کنایوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور مَیں اُٹھ کھڑا ہُوا-

اس کی ماں گھر پر رہ گئی لیکن باپ ہمارے ساتھ تھا- چوتھی بستی میں پہنچ کر مَیں نے ایک ایسا جھونپڑا دیکھا جو ان بستیوں کے جھونپڑوں سے مختلف اور ممتاز تھا- مجھے فوراً" احساس ہُوا کہ ہو نہ ہو یہ ان کے سردار کی رہائش گاہ ہے-

وہاں بہت سے لوگ جمع تھے' جیسے کوئی خاص رسم ہونے والی ہو- ہمارے پہنچنے پر سب نے تالیاں بجا بجا کر ہمارا استقبال کیا- جھونپڑے کے باہر ایک سٹیج سا بنا ہُوا تھا' جس پر شیر اور چیتوں کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں- سٹیج کے عین وسط میں ایک خوبصورت تخت رکھا تھا-

لڑکی میرے بازو سے چمٹی ہوئی تھی- وہ بڑی خوش تھی اور ہنس ہنس کر ایک ایک کی بات کا جواب دے رہی تھی---- اچانک قہقہے رک گئے' شور بند ہو گیا- ادب اور احترام سے لوگوں کے سر جھک گئے- سامنے سے تقریباً" پچاس برس کی عمر کا ایک تنومند اور بارعب شخص سٹیج کی طرف آ رہا تھا- وہ نوجوان بھی اس کے ساتھ تھا جس کے احترام میں کل بستی کے سب لوگ جھک گئے تھے- یہ وہاں کا سردار اور اس کا بیٹا تھا-

سردار مسکراتا ہُوا تخت پر بیٹھ گیا اور اپنی زبان میں کچھ بولا- جھکی ہوئی گردنیں سیدھی ہو گئیں اور تالیوں کا ایک بے پناہ شور بلند ہُوا- سردار کی مسکراتی ہوئی نگاہیں گھومتی ہوئی مجھ پر آ کر رک گئیں- باقی لوگ بھی میری طرف دیکھنے لگے-

سردار نے ہاتھ سے اس طرح اشارہ کیا جیسے ہمیں بلا رہا ہو- لڑکی خوشی سے اچھل پڑی- اس کا باپ میری طرف بڑھا- میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے سردار کے پاس لے جانا چاہتا ہے-

سردار کے داہنے ہاتھ وہ نوجوان کھڑا مسکرا رہا تھا اور بائیں ہاتھ ایک شخص ہاتھ میں تھال لئے مؤدبانہ انداز میں کھڑا تھا- تارا کہہ کر سردار لڑکی سے مخاطب ہُوا اور دیر دیر تک ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرتا رہا- مَیں نے اندازہ لگایا کہ لڑکی کا نام تارا ہے-

سردار نے تھال پر سے چیتے کی کھال کا سرپوش اٹھایا- اس میں سفید موتیوں کی ایک مالا رکھی تھی- مالا لے کر سردار اٹھا اور میرے گلے میں ڈال دی- مَیں حیران اِدھر اُدھر دیکھنے لگا- اِدھر سب لوگوں نے خوشی کے نعرے بلند کئے اور گانے ناچنے لگے- تارا اچھل رہی تھی اور میرے آگے پیچھے ناچ رہی تھی- میں احمقوں کی طرح ایک ایک کا منہ تک رہا تھا- کچھ عرصے بعد جب میں ان کی زبان کچھ کچھ سمجھنے لگا تو معلوم ہُوا کہ یہ مالا پہنانے کی رسم دراصل میرے وہاں رہنے کا اجازت نامہ تھا-

تارا کی خواہش پر مجھے تارا کے والد کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی- ورنہ عام طور پر ایسے آدمی سردار کی پناہ میں آ جاتے اور وہی ان کے رہنے سہنے کا انتظام کرتا تھا-

مالا پہنانے کی رسم کے بعد تارا نے مجھے ساری بستیوں میں پھرایا- میں

ایک عجیب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ نوجوان لڑکیوں' لڑکوں اور بچوں کا ایک مجمع ہمارے ساتھ تھا مگر اب مجھے کسی قسم کے خطرے کا احساس نہیں ہو رہا تھا' بلکہ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی بے حد حسین خواب دیکھ رہا ہوں۔

غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے ہم گھر پہنچ گئے۔ تارا لپک کر ماں سے لپٹ گئی اور بلبل کی طرح چہکنے لگی۔ زبان کے علاوہ اس کے ہاتھ' پیر' آنکھیں اور جسم کا انگ انگ بول رہا تھا۔ اس کا باپ بے حد گمبھیر لیکن معصومانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔۔۔۔ میں دن کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ تارا سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہی مگر کسی کو اس پر اعتراض نہیں تھا۔ ممکن ہے ان کے سماج میں یہ بات عیب نہ ہو۔ بہر کیف تارا کی جوان اور سرور انگیز قربت سے میرا رواں رواں متاثر تھا اور یہ تاثر میری روح میں اتر گیا تھا۔



رات کو جب میں بید کی چٹائی پر لیٹا تو مجھے گزشتہ رات کا سپنا یاد آیا۔ یہ یاد پھول کی پنکھڑیوں کی طرح نازک' ملائم اور رنگین تھی۔ میری کٹیا میں ابھی روشنی تھی۔ بید نما چھڑی موم بتی کی طرح دھیرے دھیرے جل رہی تھی۔ اس کی لَو سرخی مائل سفید تھی اور آنکھوں کو بہت بھلی لگتی تھی۔

تارا نے مجھے سمجھایا تھا' اشاروں کنایوں سے۔۔۔۔ کہ اس کی لَو پھونک مارنے سے نہیں بجھتی۔ اس نے پچھلی رات بار بار پھونکیں مار کر یہ بات میرے ذہن نشین کی تھی۔ واقعی اس کے شعلے میں بڑی لچک تھی۔ پھونک مارنے سے یوں معلوم ہوتا کہ بجھ گئی۔ مگر دھیرے سے ایک ننھی سی لَو پھر سے اُبھر آتی۔ بعد میں تارا نے انگوٹھے برابر لکڑی کا ایک ٹکڑا' جو اندر سے کھوکھلا تھا' لَو پر رکھ کر اسے بجھا دیا تھا۔۔۔۔ وہ ٹکڑا وہیں نیچے اس لکڑی پر رکھا ہُوا تھا' جس میں چھڑی کو کھڑا کرنے کے لئے مختلف سوراخ تھے۔ چھڑی جس سائز کی ہوتی اسی سائز کے سوراخ میں کھڑی کر دی جاتی۔ گز بھر کی چھڑی کم از کم ہفتے بھر

جلتی تھی۔

مَیں نے لکڑی کا ٹکڑا اٹھا کر بتی بجھا دی اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ جوانی کی نیند' جب چاہو صدا دے دو۔۔۔ پلکیں نیند سے بوجھل ہو چلی تھیں کہ معاً" پھر اسی لطیف لمس کا احساس ہُوا۔ میں چونکا مگر پھر فوراً" یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ کہیں یہ سپنا ٹوٹ نہ جائے۔

دو نرم نرم ہاتھ میرے پاؤں دھیرے دھیرے سہلا رہے تھے۔ مَیں پوری قوت سے اپنے ذہنی اور جسمانی ردِ عمل پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے سینے میں ایک طوفان مچل رہا تھا۔۔۔ اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ یہ تارا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

ہاتھوں کے ریشمی لمس سے میری روح ایک فردوسی احساس سے وارفتہ ہو چلی تھی کہ اس نے اپنے گرم گرم ہونٹ میرے پاؤں پر رکھ دیے اور گھور اندھیرے میں اس کی عقیدت کی کرنیں میرے من کو گدگدا گئیں۔ ابھی میں ان مسرتوں سے محظوظ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے گالوں سے میرے پاؤں سہلانے لگی۔

آہ۔۔۔۔ ان آتشیں رخساروں کے لمس کی حرارت۔ عورت کے وجود کی گرمی اور اس کے جسم کی خوشبو کا احساس اس سے پہلے مجھے کبھی نہ ہُوا تھا۔

گال سہلاتے سہلاتے اس نے پھر ہونٹ میرے پاؤں پر رکھ دیے۔ شاید یہ الوداعی بوسہ تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بانسوں کا بنا ہُوا دروازہ دھیرے سے کھول کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ دسویں کے چاند کی روشنی میں اس کا چہرہ صاف پہچانا جا سکتا تھا۔

وہ تارا تھی۔۔۔

وہ محبت تھی۔

وہ زندگی تھی۔

میں خوشی کی ایک لمبی آہ کھینچ کر مسکرایا اور پھر کروٹ بدل کر دروازے کی درزوں میں سے آتی ہوئی روشنی کو ٹکٹکی باندھے جانے کتنی دیر دیکھتا رہا۔

صبح کو وہ مجھے بستی سے چار پانچ میل دور ایک چشمے پر لے گئی۔ یہ چشمہ اونچی اونچی چٹانوں سے گھرا ہُوا تھا اور تقریباً" تیس فٹ نیچے تھا۔ نیچے جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ چشمے کے منبع کے قریب ایک تناور درخت کھڑا تھا جس کی شاخیں اوپر کی چٹانوں تک پہنچ گئی تھیں اور ان شاخوں پر سے نیچے اترا جا سکتا تھا۔ نیچے نہایت دل کش' ٹھنڈی اور پُر سکون جگہ تھی۔

تارا گلہری کی طرح تیزی سے نیچے اتر گئی۔ میں بڑی مشکل سے ڈرتے ڈرتے اترا۔ وہ بھولپن سے ہنس رہی تھی۔

ہماری قربت بے زبان تھی۔۔۔ بالکل گونگی۔۔۔۔ مگر میرے سینے میں یہ خواہش تڑپ رہی تھی کہ اسے بتا سکوں کہ اس کا ساتھ میرے لئے کتنا انمول ہے۔ کس قدر قیمتی!

پھر مجھے ایک طریقہ سوجھا اور آبشاروں کے ترنم اور پتوں کی سرسراہٹ کی زبان میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اپنے بالوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔

"یہ بال ہیں"۔

پھر اس کے الجھے ہوئے بالوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔"یہ بھی بال ہیں"۔

وہ سمجھ گئی اور ہنس کر بولی۔ "بال بال"۔

میں نے اپنی اور پھر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔ "یہ آنکھیں ہیں"۔

اس نے میری تقلید کی۔ "آکھیں آکھیں"۔

میں نے اس کی گول اور خوبصورت ٹھوڑی کو اٹھا کر کہا۔ "یہ ٹھوڑی

ہے"۔

"ٹڈی ٹڈی"--- وہ بچوں کی طرح ہنس رہی تھی۔

اب بات چل پڑی تھی۔ پانی' پتھر' درخت سب کے نام گنوائے گئے۔ وہ بڑی آسانی سے ہر بات سمجھ رہی تھی۔ میں نے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھا اور اپنا نام بتایا۔

"اسد"۔

"ہو ہو ہو"۔

وہ اس طرح ہنسی جیسے سمجھ رہی ہو---- میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "تمہارا نام تارا ہے نا؟ تارا۔ تارا"۔

وہ ہنس پڑی اور سوالیہ لہجے میں بولی۔

"ناتا---- نام---؟"

میں نے اثبات میں سرہلایا۔ ناتا ان کی زبان میں نام کا ہم معنی لفظ تھا۔ وہ ہنستے ہنستے نفی میں سرہلانے لگی۔ "تارا نا"۔

پھر میری طرح چھاتی پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"نام-- ناتا---- نام---- تن تارارا----"

"تن تارا----- را-----!"

جیسے بہت سارے تار ایک ساتھ جھنجھنا اٹھے ہوں اور فضا میں نغمے بکھر گئے ہوں ان کی لرزش سے ساری کائنات مرتعش ہو گئی---- کتنا انوکھا اور پیارا نام تھا۔

"تن....... تا........ را...... را......."

کس قدر شعریت اور کس قدر سنگیت بھرا نام تھا----- میں صورت اور نام کے رنگین جال میں ایسا جکڑ کر رہ گیا تھا کہ آگے پیچھے کی سدھ نہ رہی۔ یہ سب حقیقت تھی مگر میں اس سے خواب اور حقیقت میں امتیاز نہ کر سکتا تھا کہ حقیقت کہاں سے شروع ہوتی ہے اور یہ خواب کہاں جا کر ختم ہوتا ہے۔

چشمے کا پانی ابل ابل کر ریت کے ذروں کو یوں اچھال رہا تھا جیسے دیگچے میں اُبلتے ہوئے پانی کے بھبکے---- زمین کے گرم سینے سے رہائی پا کر چشمے کا پانی ٹکریں مارتا' نغمے بجاتا' نامعلوم منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔

دن گزرے' ہفتے گزرے۔ اب میں ان لوگوں میں بالکل گھل مل گیا تھا اور ان کی زبان بھی سمجھنے لگا تھا۔ ہم دن بھر شکار کھیلتے یا جنگلی پھل اکٹھے کرنے کے لئے پہاڑوں میں گھومتے۔ تن تارارا پل بھر کے لئے بھی میرا ساتھ نہ چھوڑتی۔

اس رات جب میں روشنی بجھا کر لیٹ گیا--- تو سوچنے لگا' آج وہ آئے گی تو اسے چپکے سے پکڑ لوں گا۔

معاً" ہولے سے دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا---- میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ معمول کے مطابق دبے پاؤں میرے پیروں کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے چپ چاپ بیٹھی رہی جیسے کمرے کی تاریکی سے اپنے آپ کو مانوس کر رہی ہو۔ اتنی دیر میں مَیں بڑی آہستی سے اُٹھ بیٹھا تھا اور اپنے دونوں پیر سمیٹ کر ان کی جگہ ہاتھ رکھ لئے تھے۔ اسی لمحے تن تارارا کے بڑھتے ہوئے ہاتھ میرے ہاتھوں کو چھو گئے اور میں نے اسے پکڑ لیا۔

"وہ اوئی کر کے اٹھی اور ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر دروازے کی طرف لپکی۔ مَیں بھی تیزی سے اٹھا مگر وہ میری پہنچ سے نکل چکی تھی۔

صبح کو وہ غائب تھی اور دن بھر غائب رہی۔

ماہ ڈیڑھ ماہ میں یہ پہلا دن تھا جو اس کے بغیر گزرا۔۔۔۔۔ شام کو وہ تب لوٹی جب کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ ماں نے پوچھا تو بولی۔ "انار کھانے گئی تھی۔"

رات اس کے انتظار میں پلکیں جھپکتے جھپکتے گزر گئی' مگر وہ نہ آئی اور دوسرے دن صبح وہ پھر تڑکے ہی نکل گئی۔ اب وہ روز منہ اندھیرے نکل جاتی اور شام کو اندھیرا ہونے سے پہلے نہ لوٹتی۔ میرا سامنا کرنے سے کتراتی تھی۔۔۔۔ روز کوشش کرتا کہ سویرے اٹھ کر اس کا پیچھا کروں مگر اسے جیسے میرے ارادوں کا علم تھا۔ روز طرح دے جاتی۔

میں دن بھر اسے تلاش کرتا۔ بستیوں میں' پہاڑیوں میں' ہر اس جگہ جہاں وہ مجھے لے گئی تھی' مگر وہ کہیں بھی نہ ملتی۔

میں زیادہ دیر اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج رات جاگتے ہی گزار دوں گا۔ جیسے بھی ہو اس کا پیچھا کروں گا۔ اسے پکڑوں گا اور اس کی بے رخی کی وجہ پوچھوں گا۔ بتی بجھا کر میں چپکے سے باہر نکل آیا اور کدو کے پودے کے پیچھے جو دونوں کٹیوں پر پھیلا ہوا تھا۔ چھپ کر بیٹھ گیا۔۔۔۔

ساری بستی میں سناٹا تھا۔ لوگ شام ہوتے ہی سو جاتے تھے۔

ہلکی ہلکی میٹھی میٹھی خنکی تھی۔ اندھیرے میں اربوں اور کھربوں بلکہ اس سے بھی زیادہ جگنوؤں نے عجیب سماں باندھ رکھا تھا۔ جگنوؤں کی اس قدر بہتات میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

زندگی میں جذباتیّت کا بھی ایک دور ہوتا ہے۔ یہ دور جنونی کیفیات کا حامل سہی مگر سچائی سے خالی نہیں ہوتا۔

چاند مغربی افق میں چھپ گیا تھا۔ بالکل اسی سے مشرقی افق پر پو پھٹ رہی تھی۔ دونوں افق ایک ہی جیسی ملگجی روشنی کا تاج پہنے ہوئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آج مغرب اور مشرق دونوں اطراف سے سورج طلوع ہو گا۔

یہ بے حد حسین صبح تھی اور ایسی صبح میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔

عین اسی لمحے تن تارارا کی کٹیا کا دروازہ کھلا اور میں چونک اٹھا۔ اس کا چہرہ ہلکے ہلکے اندھیرے میں افق کی نرم نرم روشنی کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ میری کٹیا کے دروازے پر آ کر چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر دھیرے سے دروازے کی درزوں سے اندر جھانکنے لگی مگر کٹیا میں ابھی اتنی روشنی نہیں تھی کہ وہ میری عدم موجودگی کا اندازہ لگا سکتی۔ وہ ہولے سے پیچھے ہٹ گئی۔

ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ لپک کر اسے پکڑ لوں مگر پھر فوراً" ہی ایک اور خیال نے اس خیال کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے سوچا اس کا پیچھا کرنا چاہئے۔ دیکھوں یہ دن بھر کہاں غائب رہتی ہے اور میرے بغیر اس کا طویل دن کیسے اور کیونکر گزرتا ہے۔

❋ ❋ ❋

اب سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ میں تارا کا پیچھا کرتے کرتے اس چشمے تک پہنچ گیا تھا۔ جہاں وہ ایک روز مجھے لائی تھی۔ وہ نیچے اتر گئی اور میں وہیں درخت کی شاخوں کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اسے انہی شاخوں پر سے اوپر آنا تھا۔

اس کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی جس سے اس کے مزاج کی کیفیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد گنگناہٹ کی آواز بند ہو گئی اور ایسا لگا جیسے کوئی پانی میں ڈبکیاں کھا رہا ہے۔۔۔۔ میں آہستہ سے کھڑا ہو گیا اور نیچے جھانکنے لگا۔

اف خدایا۔۔۔۔۔۔

کیسا قیامت خیز منظر تھا۔۔۔۔ وہ کپڑوں کی قید سے آزاد پانی میں کھڑی تھی۔۔۔ جیسے جل پری۔۔۔ کمان کی طرح تنا ہوا جسم۔ جیسے کسی ماہر سنگ تراش نے اس کے تیکھے زاویوں کو ابھارنے کے لئے زندگی کا خراج پیش کیا ہو۔۔۔ یا کسی شاعر نے شباب کے موضوع پر شعر کہنا چاہا اور نہ کہہ سکا تو فطرت نے اس شعر کے تخیل کو تن تارارا کے روپ میں مجسم کر دیا۔

ایک لمحے کے لئے خیال آیا' پیچھے ہٹ جاؤں مگر یہ خیال ہوا کا ایک جھونکا تھا۔ آیا اور گزر گیا۔۔۔۔ مجھے لگا جیسے اس لمحے کوئی اخلاقی قدر میرے کام نہیں آ سکے گی۔۔۔ اتنی سنگین حقیقت دیکھ کر میں آنکھیں بند نہیں کر سکتا تھا۔

وہ پانی میں غوطے کھاتی اور پھر ابھر کر کھڑی ہو جاتی۔ پھر دونوں ہاتھ منہ اور آنکھوں پر ملتی اور مسکرا کر دوبارہ وہی حرکت کرتی۔ ایک بے پناہ اور انجانی قوت نے مجھے جنسی عفریت کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ ہر لمحہ میری دیوانگی اور سرمستی میں اضافہ کر رہا تھا۔

سورج کی ایک شوخ کرن گھنے درخت کے پتوں میں سے چھن چھن کر اس کے خوب صورت سیمیں جسم پر کھیل رہی تھی۔ وہ حرکت کرتی تو کرن تتلی کی طرح کبھی اس کی گردن پر' کبھی رخساروں پر اور کبھی آنکھوں پر سنہری مہریں لگاتی۔

یہ بیک وقت بے حد روح پرور' روح فرساں' لذت بخش اور اذیت ناک منظر تھا۔۔۔۔ داخلی اور خارجی کشمکش کا حسین اور تکلیف دہ امتزاج۔۔۔۔ اسی عالم وارفتگی میں میں ایک دو قدم اور آگے بڑھا تو ایک چھوٹا سا پتھر میرے پاؤں سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا۔ اس نے چونک کر اوپر کو دیکھا اور دوسرے لمحے وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر سانپ کی طرح پانی کو چیرتی ہوئی نکلی اور خرگوش کی طرح اچک کر ایک چٹان کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس نے خود کو چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن میں بلندی پر تھا اس لئے چھپ نہ سکی۔ اس کے کالے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان سے پانی رس رہا تھا اور یہ ننھی بوندیں موتیوں کی طرح اس کے جسم پر رینگ رہی تھیں۔

اس کے کپڑے چشمے کی دوسری طرف ایک پتھر پر رکھے ہوئے تھے۔ اس

نے ایک نظر کپڑوں کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ اوپر کی طرف نگاہ اٹھائی۔۔۔۔ میں اسی طرح مسکرا مسکرا کر پوری ڈھٹائی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بجلی کے کوندے کی طرح پانی میں کودی اور غوطہ کھا کر اس پتھر کے پاس جا نکلی جہاں اس کا چیتے کی کھال کا لہنگا پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے دونوں چیزوں کو کھینچا اور گردن تک پانی میں ڈوب گئی۔ پانی کے اندر ہی اس نے لہنگا پہنا اور سینہ بند باندھنے لگی۔۔۔ میری طرف اس نے پیٹھ کر لی تھی۔

اس اضطرابی کوشش میں اس کے مرمریں شانے کبھی کبھی پانی سے ابھر آتے اور بجلی کی سی چکا چوند پیدا ہو جاتی۔۔۔ اس سے ساری کائنات سمٹ کر تن تارارا کا وجود بن گئی تھی۔

لباس پہن کر وہ پانی میں کھڑی ہو گئی اور گردن جھٹک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس وقت وہ غیظ و غضب کی دیوی معلوم ہو رہی تھی۔۔۔۔ پھر وہ نفرت سے منہ پھیر کر پانی سے نکلی اور پیڑ پر چڑھنے لگی۔ میں نے اس کی نفرت اور غصے کے تاثر کو عارضی رد عمل سمجھا اور اس کے دلی درد و کرب کا اندازہ نہ کر سکا۔۔۔ پیڑ سے چھلانگ لگا کر وہ بھوکی شیرنی کی طرح جھپٹی اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلوں وہ دھکا دے کر مجھے گرا چکی تھی اور میرے سینے پر چڑھ بیٹھی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے جنگلی بلی کی طرح میرے شانوں کو دانتوں اور ناخونوں سے نوچ ڈالا۔ میں نے بچاؤ کے لئے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو وہ مچھلی کی طرح پھسل کر میری گرفت سے نکل گئی اور ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

شام کو گھر پہنچا تو ماحول میں کسی قسم کی تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ ظاہر تھا کہ تن تارارا نے دن کے واقعے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ حسب معمول گھر پر نہیں تھی۔

ماں سے پوچھا۔ تو وہ بولی "نہ جانے اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔ روز صبح سویرے چلی جاتی ہے آج آئے تو کان کھینچوں گی اس کے"۔

"نہ ماں، تم اسے کچھ نہ کہنا۔ میں ایک دو دن میں اسے پکڑ لوں گا"۔

"پکڑ لو گے؟"

تارارا کا باپ قہقہہ لگاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ وہ ایک شکار کی ہوئی نیل گائے کندھے پر لادے ہوئے تھا۔

"ارے اٹھو بیٹے۔ وہ چھرا اٹھا لاؤ۔ میں سردار کا حصہ الگ کر دوں، باقی تم ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔۔۔۔ اری اٹھ نیک بخت تیرا تو چولہا ہی ٹھنڈا ہے۔ جلدی سے آگ سلگا آج رات سونا تھوڑا ہی ہے"۔

تارا کی ماں ہنس کر آگے بڑھی۔ میں اندر سے چھری اٹھا لایا۔ ان دونوں نے نیل گائے نیچے رکھ دی تھی۔ بڑھیا بڑے شوق سے نیل گائے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ بڈھا اترانے لگا۔

"آج تو پہلا وار ہی نشانے پر ٹھیک بیٹھا۔ یہ دیکھو تیر گردن کے آر پار ہو چکا ہے۔ چھوٹے سردار راستے میں ملے تھے۔ نشانہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بہت کم شکاریوں کا نشانہ گردن کے آر پار جاتا ہے"۔ بڈھے نے پچھلی ٹانگ کاٹ کر الگ کر دی۔

"یہ سردار کا حصہ اور یہ دوسری ٹانگ گاؤں والوں میں بانٹ دو۔ اپنے کھانے کے لئے جتنا چاہو الگ کر لو اور باقی کا سارا بھون کر خشک کر لو۔ اس طرح کا ایک اور شکار ہاتھ آ گیا تو ساری سردیاں آرام سے گزر جائیں گی۔ اری وہ نیل گائے کے گوشت پر مرنے والی تن تاری کہاں ہے؟"

"اسے کیا پتا کہ تم آج اتنا بڑا شکار مار کر لاؤ گے۔ کسی سکھی سہیلی کے ہاں پریوں کی کہانی سن رہی ہو گی"۔

"بڈھا ہنس پڑا اور سردار کے حصے کی ٹانگ اٹھا کر بولا۔ "آئے گی تو بہت خوش ہو گی۔ اچھا میں جا رہا ہوں' دیر ہو جائے تو انتظار نہ کرنا۔ تم لوگ کھاؤ پیو مگر آگ ٹھنڈی نہ ہو جائے"۔

بڈھا چلا گیا۔۔۔۔ بڑھیا بولی۔ "بیٹا' تم پچھلی ٹانگ کے ٹکڑے کر کے مجھے حصے بنا دو تاکہ پڑوسیوں میں بانٹ آؤں۔ باقی گوشت تم کاٹتے رہو۔ اتنی دیر میں میں آ جاؤں گی"۔

میں گوشت کاٹ کر فارغ ہوا تو بڑھیا بولی۔

"باقی کا گوشت کاٹنے میں تمہیں مشکل ہو گی۔ میں تارارا کو ابھی بھیجتی ہوں۔ ہاں گردے' کلیجی اور دل الگ رکھنا۔ میں اپنے ہاتھ سے تم لوگوں کو کھلاؤں گی۔۔۔ ہاں"۔

بڑھیا چلی گئی اور میں تارارا کا انتظار کرنے لگا۔۔۔۔ سوچا آئے گی تو آج کے واقعے پر معذرت کروں گا۔ واقعی میں نے اس کی عزت نفس کو مجروح کیا تھا۔ اس کا مجھے احساس تھا مگر وہ نہ آئی۔

بڈھا آ گیا تھا۔ بڑھیا بھی آ گئی اور بار بار تن تارارا کی غیر حاضری کو کوستی رہی۔ بڈھا بے حد خوش تھا اور گرم گرم بھونے ہوئے گوشت کی تعریف کر رہا تھا۔ گوشت واقعی بہت لذیذ تھا۔ مجھے بھی بہت مزہ آ رہا تھا۔ اس رات ہم نے بھنے ہوئے گوشت کے سوا کچھ نہ کھایا۔

بڈھے نے انگڑائی لی۔ وہ کھانے کے فوراً بعد سونے کا عادی تھا۔ بڑھیا ہر پانچ منٹ کے بعد تن تارارا کو ایک پیار بھری گالی سے نوازتی رہی۔ بڈھا سونے کے لئے اٹھا اور بیوی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"نیک بخت' کیوں اپنے آپ کو پریشان کر رہی ہے۔ کہانی نیل گائے کے گوشت سے دلچسپ ہو گی' جبھی نہیں آئی' تم اس کا حصہ دروازے کے پاس لٹکا دو' خود تلاش کر لے گی۔ چلو اٹھو اور سو جاؤ"۔

وہ شوہر کے ساتھ کٹیا میں چلی گئی۔ میں بھی آ کر لیٹ گیا۔

صبح تن تارارا حسب معمول غائب تھی۔ اس کی ماں ہنس ہنس کر شوہر سے کہہ رہی تھی۔ "دیکھ۔۔۔۔ سارا گوشت کھا گئی ہے' ایک بوٹی بھی نہیں چھوڑی"۔

بڈھے کی باچھیں کھل گئیں۔ "آخر ہماری بیٹی ہے نا"۔

"ہوں"۔ بڑھیا نے منہ بنایا۔ "جنی میں نے ہے' تم نے نہیں"۔

"ہاں بھئی تم نے جنی ہے۔ آسمان سے لائی تھی۔ ناگ دیوتا بیٹیاں بانٹتے پھرتے ہیں نا۔۔۔۔"

بڈھے نے گویا اپنے طور پر چوٹ کی مگر بڑھیا بھی کم نہیں تھی بولی۔

"ان مردوں کو نہ جانے کس بات کا مان ہوتا ہے۔ میں کہتی ہوں مرغی نہ ہوتی تو انڈا کہاں سے آتا؟"

"اور انڈا نہ ہوتا تو مرغی کہاں سے آتی؟"

ایسی چخ چخ وہ ہمیشہ کرتے تھے اور اس میں تلخی کے بجائے گھلاوٹ ہوتی تھی۔ بڈھا بیوی کو بہت چاہتا تھا۔ تن تارارا ان کی ساتویں اولاد تھی۔ پہلے چھ میں سے دو بچے مردہ پیدا ہوئے تھے۔ چار ایک ایک دو دو دن جی کر مر گئے تھے۔ اس لئے تارارا اُن کی چہیتی بیٹی تھی۔

پروگرام کے مطابق آج باقی ماندہ گوشت اُبالنا تھا۔ اُبال کر پرونا اور پھر

اسے سکھانے میں مجھے بڑھیا کا ہاتھ بٹانا تھا۔ ادھر تن تارارا سے ملنے کی لگن
تھی۔ میں بڑھیا کی آنکھ بچا کر نکل گیا۔



خیال تھا آج وہ چشمے پر نہیں جائے گی۔ اس لئے میں اسے ادھر ادھر
تلاش کرتا رہا۔ لیکن جب کہیں نہ ملی تو مجبوراً" چشمے کا رخ کرنا پڑا۔

میں نے دبے پاؤں ایک جھاڑی کی آڑ لے کر نیچے دیکھا ---- وہ بائیں
ہاتھ کی ہتھیلی پر سر رکھے اور کہنی زمین پر ٹکائے لیٹی ہوئی تھی اور چشمے پر ٹکٹکی
لگائے سوچوں میں غرق تھی۔ میں بڑی احتیاط سے نیچے اترا۔

جانے کن خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ پلکیں جھپکائے بغیر اس کی نگاہیں
ایک ہی نقطے پر مرکوز تھیں۔ چہرے پر یاس اور گھمبیرتا تھی۔ میں چند لمحے
خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اسے اب بھی خبر نہ ہوئی۔

یہ مجھے یقین تھا کہ وہ بدکے گی نہیں۔ لڑے گی نہیں --- بھاگے گی بھی
نہیں۔ آج اس کا سلوک بالکل مختلف ہو گا ---- یہ سوچ کر دھیرے سے میں
نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ ایک لمحے کے لئے گھبرا
گئی اور میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ لیکن اس کی نگاہوں میں کل

کی طرح سختی کے بجائے استعجاب بھری نرمی تھی۔ خود میرا انداز بھی ندامت آمیز تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں جھکا لیں۔ جیسے مجھے پہچان گئی ہو۔ خود وہ بھی آج ایک نئی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ نئی، پیاری، البیلی، شرمندہ اور محجوب سی۔

وہ اپنا نچلا ہونٹ مضطربانہ چبا رہی تھی۔ نگاہیں نیچی تھیں اور ریت پر بے مقصد لکیریں کھینچ رہی تھی اور مٹا رہی تھی۔ نہ جانے رات وہ کس کش مکش سے گزری ہو گی حالانکہ مجرم میں تھا۔

یہ لمحے بڑے پیارے تھے۔ روشن اور گھمبیر---- میری روح میں گدگدی سی ہوئی۔ یہ گدگدی بے حد لطیف تھی۔ اور لطافت کا یہ احساس بہت نفیس، کومل اور ملکوتی تھا۔ شاید یہی پیار تھا۔ یہی ہو گا---- ایسی خوشی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

میں نے اس کا ننھا منا گول مول خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ اس کے انداز میں سپردگی تھی۔ نظریں بدستور ریت پر گڑی تھیں۔ میں نے ہولے سے کہا۔

"تارارا"۔

اس نے اوپر کا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ میں ایک دو لمحے اس کا ہاتھ سہلاتا رہا۔ پھر داہنے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی---- اس کی پلکیں بند تھیں اور اس کی آنکھوں کے گوشوں میں پیارے پیارے آنسو چمک رہے تھے۔ میں نے یہ موتی اپنے ہونٹوں سے چن لئے۔

اس کی بھیگی پلکیں بند تھیں۔ شہابی رخسار دمک رہے تھے۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نتھنے تھرک رہے تھے۔ مرمریں گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور عنابی ہونٹ لرز رہے تھے۔

میں نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے عنابی ہونٹوں سے پیوست کر دیے---- پہلی کلی چٹکی---- پہلا پھول کھلا---- یہ میری زندگی کا پہلا بوسہ تھا اور شاید تن تارارا کا بھی---- رنگین، آتشیں کوئی اس لمس کو لفظوں میں کیونکر بیان کر سکتا ہے۔ بس یوں لگا ساری کائنات ہیچ ہے۔ ہونٹوں کا لمس زندگی کی آخری سعادت ہے۔

جب میں نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے الگ کئے تو بھی اس کی پلکیں بند تھیں۔ ہونٹ لرز رہے تھے۔ آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ بھی ایک سماں تھا۔ میں خاموشی سے اس کیفیت کو دیکھتا رہا۔ اس میں بھی ایک لذت تھی۔ کیف تھا، راحت تھی۔ میں نے اس کے گیلے گیلے غلافی پپوٹوں پر انگلی پھیری اور پلکوں میں الجھے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا۔ چند لمحے بعد اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں اور نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ ان نگاہوں میں اطمینان، تسلی، ٹھہراؤ اور تسکین تھی۔ میں دوبارہ اس کے ہونٹوں کی طرف جھکا۔ وہ بے قرار سی ہو گئی۔ تڑپ کر مجھ سے لپٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔

اس وقت ایک روح دوسری روح سے ہم کلام تھی۔ چشمے کا نقرئی پانی جگمگا رہا تھا اور نا معلوم منزل کی طرف رواں دواں تھا۔

چونکہ چشمہ بہت گہری جگہ پر تھا اس لئے سورج نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھندلکا سا چھا گیا تھا۔ مگر تن تارارا ابھی جانے پر رضامند نہیں تھی۔ وہ میری چھاتی پر سر رکھے ہوئے تھی اور بہت بشاش نظر آ رہی تھی۔

معاً" چشمے میں دھڑام سے ایک پتھر گرا اور اس کے چھینٹوں سے ہمارے آدھے جسم بھیگ گئے۔ ہم دونوں لپک کر اٹھ بیٹھے اور حیرت سے دائیں بائیں دیکھنے لگے۔

اچانک تارارا نے اوپر دیکھا اور چیخ پڑی۔ "تائی کارا"

میں نے بھی نظر اٹھائی۔ اوپر سردار کا بیٹا کھڑا ہمیں گھور رہا تھا۔ کہاں تو سردار اور سردار کے بیٹے کے احترام میں تن تارارا جھک جایا کرتی تھی اور کہاں آج اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔

"تائی کارا۔۔۔۔ تم کیوں آئے؟" وہ چیخی۔ "تم نے ہمارا پیچھا کیوں کیا؟"

سردار کے بیٹے کے چہرے پر غصہ' نفرت اور آنکھوں میں رقابت کا احساس تھا۔

تن تارارا نے میری طرف دیکھا اور بولی۔ "ری"۔

اور دوسرے لمحے بلی کی طرح درخت پر چڑھنے لگی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ منٹوں میں اوپر پہنچ گئی اور تن کر سردار کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"تو اکیلی اس کے ساتھ گھومتی ہے؟"۔

"ہاں گھومتی ہوں۔ گھومتی ہوں۔ گھومتی ہوں۔ گھوموں گی"۔

"تو اس کی چھاتی پر سر رکھتی ہے۔ اسے چومتی ہے۔ بتا یہاں ایسا کب ہوتا ہے؟"

"ہوتا ہے یا نہیں۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ تو جلتا ہے مجھے اس کی بھی پروا نہیں"۔

اب میں بھی اوپر پہنچ گیا تھا۔

سردار کے لڑکے نے میری طرف خشمگین نگاہوں سے دیکھا مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے تن تارارا نے زور زور سے پاؤں زمین پر مارے۔ وہ غصے سے پاگل ہوئے جا رہی تھی۔

"تم اسے کیوں گھور رہے ہو؟ تم سردار کے بیٹے ہو' ٹھیک ہے مگر تم کو ہمارے دلوں پر حکومت کرنے کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا"۔

سردار کا بیٹا چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"تم ہوش میں نہیں ہو ورنہ تم میرے مرتبے کو یوں نہ بھول جاتیں"۔

تن تارارا ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی۔ "ہاں میں ہوش میں نہیں ہوں اور میں ہوش میں آنا بھی نہیں چاہتی۔ اس لئے کہ تم اپنے مرتبے کی خود دھجیاں اڑا چکے ہو"۔

وہ تڑ تڑ بول رہی تھی۔ آج پہلی بار مجھے اس کی ذہانت کا احساس ہوا۔ سردار کا بیٹا زچ ہوا جا رہا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ تن تارارا ڈر جائے گی' گھبرا جائے گی' مرعوب ہو جائے گی' خود میرا بھی یہی خیال تھا۔ واقعات کا تقاضا بھی یہی تھا مگر الٹا وہ اس کے گلے پڑ گئی تھی اور اب سردار کے بیٹے کو اپنی عزت بچانی مشکل ہو رہی تھی۔ وہ جانا چاہتا تھا مگر شکست کے مظاہرے سے بھی اس کے وقار پر حرف آتا تھا۔ اس لئے خاموشی سے کھڑا رہا اور ٹک ٹک تن تارارا کو دیکھتا رہا۔

تن تارارا اس کی خاموشی سے چڑ کر بولی۔

"اب تم مجھے گھور کیوں رہے ہو؟ کیا میں تمہارے رعب سے ڈر جاؤں گی۔ میں اسد کے ساتھ سارا دن گھومتی رہی ہوں۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے اور نہ میں اسے چھپانا چاہتی ہوں۔ اگر تم اپنے باپ سے میری شکایت کرنا چاہتے ہو تو میں بخوشی اس کا جواب دینے کے لئے تیار ہوں۔۔۔۔ سچ بولنے کے لئے تو میں ناگ دیوتا کے منہ میں بھی زبان دے سکتی ہوں"۔

سردار کا بیٹا چند لمحے خاموش رہا۔ پھر قدرے نرم لہجے میں بولا۔ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے' میں سردار سے شکایت نہیں کروں گا۔ ہاں تم سے اس سلسلے میں

تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا ہوں"۔

"ابھی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"نہیں۔ اس وقت تم اپنے آپے میں نہیں ہو۔ کل پرسوں تم سے ملوں گا اور مفصل بات کروں گا"۔

سردار کے بیٹے نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔ تن تارارا اسے دیکھتی رہی۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور چہرے پر فتحمندانہ احساس کا پرتو تھا۔ میں نے اس کی ناک پکڑ کر کھینچی۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا۔ تم نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟"۔

"اچھا کیا"۔ وہ ہنس پڑی۔ "سرداری کا رعب بیچتا پھرتا ہے۔ میں تو ایک ٹکے میں بھی نہ خریدوں"۔

"اس وقت تمہاری انتہا پسندی تمہارے کام آئی مگر حقائق سے گریز نہ کرو۔ آخر وہ سردار کا بیٹا ہے"۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں اس کے پاؤں میں پڑ جاتی' گڑگڑاتی' معافی مانگتی۔ کیا کرتی؟ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ پھر میں کیوں دبتی؟ بتاؤ کیوں؟ خوامخواہ کی مجرم بن جاتی۔ ایسی بے وقوف تو میں ہرگز نہیں ہوں"۔

میں نے پیار سے اس کے منہ پر ہلکا سا چپت لگایا۔

"تم بہت ہوشیار ہو' رانی تن تارارا۔ مگر یاد رکھو۔ زیادہ جذباتی ہونے سے کبھی کبھار نقصان ہو جاتا ہے"۔

"جان چلی جائے گی نا۔ مجھے اس کی پروا نہیں' پر سچ کو سچ کہوں گی۔ میرے جذباتی ہونے میں ذرا بھی بناوٹ نہیں ہوتی۔ قدرتی طور پر جس بات کو کہنے کے لئے مجبور ہو جاؤں' ناگ دیوتا کی قسم' اس سے کبھی نہیں چوکوں گی"۔

"خوب"۔

میں ہنس پڑا۔ اس کی بات مجھے بہت پیاری لگی۔

واقعی کتنی خوبصورت بات تھی---- یعنی جذباتی ہونا نہ ہونا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے لئے قدرتی اسباب کا ہونا ضروری ہے۔ جذبات خود ساختہ چیز نہیں ہوتے۔ یہ فطری انداز میں جنم لیتے ہیں۔ یہ نقصان ضرور پہنچا سکتے ہیں' مگر راستی سے نہیں ہٹاتے۔ کس قدر سیدھی بات تھی۔ اس میں کس قدر گہرائی تھی سنا تو یہی تھا کہ جذباتیت سطحی چیز ہوتی ہے--- مگر تن تارارا کی باتیں' جو تعلیم سے کوری اور تجربوں سے عاری تھیں' سچائی سے دور نہیں تھیں۔

سورج غروب ہونے کو تھا اور سامنے کی برفانی چوٹیوں پر سنہری توے کی طرح چمک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بالکل ہمارے قریب آ گیا ہو۔ میں نے تن تارارا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر جیسے کسی نے سونا لیپ دیا ہو۔ وہ سرخ سورج کی طرح سرخ ہو رہی تھی اور بڑی حسین لگ رہی تھی۔

"شام ہو رہی ہے چلو گی نہیں؟" میں نے کہا۔

وہ سورج کو تکتے ہوئے بولی۔ "ایسا خوبصورت شفق اور ایسا حسین سورج میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ دو تین منٹ میں ڈوب جائے گا' جب تک یہیں کھڑے رہو--- تم نے کبھی ایسی خوبصورت شام دیکھی ہے؟"

"نہیں----- ایسا خوبصورت سورج میں نے کبھی نہیں دیکھا اور ایسی حسین شام کا تو کوئی خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ دیکھو بیک وقت دو آفتاب جگمگا

رہے ہیں"۔

"دو آفتاب---؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں دو آفتاب"۔ میں نے پیار سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلائی۔ ایک ڈوبنے والا اور ایک نہ ڈوبنے والا"۔

"ہوں"۔ اس نے منہ بنایا۔ "میں کوئی آفتاب ہوں"۔

"تم کیا ہو' یہ خود سے نہ پوچھو۔ سردار کے بیٹے سے پوچھو"۔

وہ ہنس پڑی۔

"سردار کے بیٹے سے پوچھوں؟ ہاں پوچھوں گی۔ تم نے اس کا نام بڑے موقع سے لیا ہے۔ بڑے ہوشیار ہو"۔

"یعنی تم مجھے ایسا بے وقوف سمجھتی ہو کہ اتنا بڑا ہنگامہ ہو' وہ سب کچھ برداشت کر جاؤں اور میں اس پر شک نہ کروں"۔

"تم اس پر شک کرو' مجھے خوشی ہوئی ہے۔ پر مجھ پر بھروسا تو رکھتے ہو نا؟"

"تم تو میرا ایمان بنتی جا رہی ہو تن تارارا۔ تم تو میرے ضمیر کی روشنی ہو۔ تمہیں تو میں اپنے آپ سے زیادہ پہچانتا جا رہا ہوں"۔

"جھوٹے------"

جھوٹے اس نے اس ادا اور انداز سے کہا کہ اس سے بہتر طریقے سے اس کی روح کی گدگدی کی ترجمانی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کے الزام کی تائید کی۔

"ہاں جھوٹا تو میں ہوں۔ زندگی سے کھیل کر جاپانی قید سے بھاگا تھا۔ ہندوستان پہنچنے کی کتنی حسرت تھی۔ ماں باپ' بہن بھائیوں اور عزیزوں سے ملنے کی کتنی تمنا تھی۔ کمل رام نے میرے لئے جان دی تھی۔ مہردین اور بلونت سنگھ سے کچھ وعدے کئے تھے۔ تم ملیں گویا کونین کی دولت مل گئی۔ نہ وطن یاد رہا نہ ماں باپ' نہ بھائی اور نہ میرے لئے جان پر کھیلنے والے پیاروں سے کئے ہوئے وعدے------ ماضی بھول گیا' مستقبل بھول گیا۔ تمہیں پا کر سب کچھ بھول گیا--- جھوٹا تو واقعی ہوں تن تارارا"۔

"پردیسی---" اس کی آواز لرز گئی---- وہ بے حد جذباتی ہو گئی تھی۔ اس کے لہجے میں شہد کی سی مٹھاس اور ریشم کی طرح نرمی تھی۔ آنکھوں میں یگانگت اور اپنائیت تھی۔ چند لمحے موہنی موہنی نگاہوں سی مجھے تکتی رہی پھر آنکھیں موند لیں اور لبوں پر ملکوتی تبسم بکھیر کر دھیرے سے میری چھاتی پر سر رکھ دیا۔

میں نے اس کے الجھے ہوئے بالوں پر لب رکھ دئے اور میری پلکیں بھی بند ہو گئیں۔ دنیا و ما فیہا کو بھول کر ہم ایک دوسرے میں کھو گئے۔ ایسا لگا کہ جسم ہی نہیں ہماری روحیں بھی ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئی ہیں۔ سورج غروب ہوگیا تھا۔ ہلکے ہلکے سرمئی اندھیرے نے چاروں طرف کاجل کی لکیر پھیر دی تھی۔ یہ عجیب خود فراموشی کا عالم تھا۔

مسرت کا۔

طمانیت کا۔

میں نے اس کا سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ان لمحوں کی موت اسے گوارا نہ تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں پر ہونٹ رکھ دیئے اور اس کی کمان کی طرح مڑی ہوئی پلکوں پر دھیرے دھیرے ہونٹ پھیرنے لگا۔

وہ میری چھاتی پر سر رکھے ہوئے تھی۔ میں نے اسے جھنجھوڑا تو اس نے

لمحہ بھر کے لئے آنکھیں کھول کر مجھے بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور دوسرے لمحے شدت احساس سے مجبور ہو کر میرے شانے میں دانت گاڑ دیئے۔ میں نے ہلکی سی آہ کی اور وہ باؤلی ہرنی کی طرح چھلانگ لگا کر اندھیرے میں غائب ہو گئی۔



صبح تڑکے جب میری آنکھ کھلی۔۔۔۔۔۔ تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ میرے پہلو میں لیٹی بے خبر سو رہی تھی اور اس کے آدھ کھلے ہونٹ میرے کندھے سے لگے ہوئے تھے۔ نہ جانے وہ رات کے کس سمے آ کر لیٹ گئی تھی۔

میں نے آہستہ سے اس کا سر سیدھا کیا۔ ملگجی صبح اب کھلتی جا رہی تھی اور دروازے کی درزوں میں سے سپیدۂ سحر کی دلہن جھانک رہی تھی۔ اس کے نیم وا یاقوتی ہونٹوں میں برف کی طرح سفید دانت ذرا ذرا سے نظر آ رہے تھے۔ جیسے دور کوئی ستارہ چمک رہا ہو۔

جوانی کی نیند۔۔۔۔۔کس بے نیازی سے اس کا انگ انگ بکھرا پڑا تھا۔ ہاتھ کہیں اور پیر کہیں۔ کٹی ہوئی ڈالی کا سایہ انداز انتہائی دلفریب تھا۔ میں دیر تک چپ چاپ اس کے سراپا کا جائزہ لیتا رہا۔

اب روشنی زیادہ ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی پھیری تو وہ ذرا سے تھرتھرائے۔

عین اسی وقت باہر کھانسنے کی آواز آئی۔ میں چونکا۔ دروازے کی طرف دیکھا اور بالکل سراپا گوش بن گیا۔ قدموں کی چاپ ادھر ہی کو آ رہی تھی۔ ہم دن بھر اکیلے گھومتے سیر کرتے رہتے تھے۔ یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں تھی۔ مگر رات بھر اکیلے کمرے میں ساتھ رہنے کا احساس کس قدر مجرمانہ تھا۔ میرا دل مارے خوف کے ڈوبا جا رہا تھا۔

"کیوں کیا بات ہے----؟"

یہ تن تارارا کے باپ کی آواز تھی۔ جواب میں تارارا کی ماں بولی۔

"وہ وہاں بھی نہیں ہے۔"

غالباً" وہ تارارا کی سہیلی کے گھر سے آ رہی تھی۔ پریوں کی کہانیاں سنتے سنتے کبھی کبھار وہ سہیلی کے ہاں سو جایا کرتی تھی۔

"وہاں نہیں ہے؟"

باپ نے حیرت اور تشویش کے لہجے میں بیوی کا جواب دہرایا۔

میں انہیں دروازے کی درز میں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ میری کٹیا سے صرف تین قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔

یکایک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور دوسرے لمحے دروازہ کھول کر آنکھیں ملتے ہوئے باہر آ گیا--- جیسے ابھی ابھی جاگا ہوں۔ ان دونوں نے میری طرف دیکھا۔

"کیوں بیٹے تن تارارا کو نہیں دیکھا؟ وہ کل سے غائب ہے رات کو بھی نہیں آئی۔ ناگ دیوتا اس کی حفاظت کرے"۔

"نہیں ماں---- میں نے تو کئی دن سے اس کی شکل نہیں دیکھی۔ لیکن گھبرانے کی کیا بات ہے۔ کہانیوں کی رسیا ہے۔ کہیں سو گئی ہو گی۔ آ جائے گی"۔

میں نے نہایت دیدہ دلیری سے جھوٹ بول دیا۔

"پاداما کے ہاں نہیں ہے۔ میں وہاں دیکھ کر آ رہی ہوں۔ کہیں اور ہو تو کہہ نہیں سکتی"۔ اس کے لہجے میں امید کی جھلک تھی مگر وہ گھبرائی ہوئی تھی۔

پاداما تن تارارا کی سہیلی کا نام تھا۔ میری نظریں کٹیا پر لگی ہوئی تھیں۔ مجھے یہ خوف ستا رہا تھا کہ کہیں وہ جاگ کر باہر نہ آ جائے۔

اب سورج طلوع ہو رہا تھا اور اس کی کرنوں نے میری کٹیا کو سنہری کر دیا تھا۔ کدو کی شاخیں کٹیا کی چھت پر لٹک رہی تھیں اور پتوں میں اٹکے ہوئے شبنم کے قطرے سورج کی کرنوں سے چمک رہے تھے۔

اس کا باپ بیوی سے بولا۔

"تم بستی کے دوسرے گھروں میں دیکھ لو۔ میں سردار کو اطلاع کرنے جاتا ہوں اور ادھر ادھر کی بستیوں میں بھی پوچھ گچھ کر لوں گا"۔

بڈھے کے لہجے میں استقامت تھی۔ شاید وہ بیوی کے سامنے اپنی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ چلا گیا۔ بڑھیا چند لمحے اسے جاتے دیکھتی رہی پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

"بیٹا۔ میں ابھی آتی ہوں۔ تم گھر پر رہنا۔ شاید وہ آ جائے"۔

میں بھی من من کے بوجھل قدم اٹھائے کٹیا کی طرف مڑا۔ جونہی میں نے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ تن تارارا سہمی ہوئی کواڑ کے پیچھے سے میرے سامنے آ گئی۔ وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں خجالت کی پریاں ناچ رہی تھیں۔ لاڈلی بیٹی کو بھی ماں باپ کے سامنے ذلیل ہونے کا احساس تھا۔ عزت نفس انمول شے ہوتی ہے۔ اس کی موجودہ کیفیت اس بات کی غماز تھی کہ گو وہ راز افشا ہونے کی ذلت سے بچ گئی ہے اور والدین کے سامنے اس کا وقار بھی

مجروح ہونے سے رہ گیا ہے مگر پھر بھی اس کی عزت نفس کو کسی حد تک ٹھیس پہنچی ہے۔ خفت اور جھینپ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

وہ ہماری باتیں سن چکی تھی اور محجوب نگاہوں سے زمین کو تک رہی تھی۔

"کیا کرنا چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ ایک دو لمحے خاموش رہی۔ پھر بولی۔

"ابا کو روکنا چاہئے۔ سردار تک بات نہیں پہنچنی چاہئے۔ ورنہ لوگ باتیں بنائیں گے"۔

"میں انہیں خبر کر دیتا ہوں۔ مگر کہوں گا کیا؟"

"ٹھہرو' وہ پاداما آ گئی"۔ تن تارارا کے چہرے پر یکبارگی رونق آ گئی۔ "اری۔ جلدی آ"۔

پاداما اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"او تاری کی بچی۔ تو نے ہمارے دل لرزا دیئے"۔

"ہمدردی بعد میں جتانا۔ جلدی سے بھاگ۔ ابا بستی سے نکل رہے ہوں گے۔ ان سے کہنا' میں تمہارے پاس سو رہی تھی"۔

"اری کم بخت ابھی ابھی تو تیری ماں ہو کر گئی ہے۔ میں اس سے کہہ چکی ہوں کہ تو میرے پاس نہیں آئی"۔

"کوئی پروا نہیں۔ تو جا کر ابا کو روک۔ میں ماں سے کہہ دوں گی کہ تمہیں ستانے کے لئے ہم نے جھوٹ بولا تھا"۔

"اچھا تو مجھے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ مگر یہ سب چکر کیا ہے! کسی چھوٹی موٹی بات کے لئے مجھ سے جھوٹ نہ بلواؤ تاری"۔

"ناگ دیوتا کی قسم' کوئی بات تجھ سے نہیں چھپاؤں گی۔ اب کوئی اور سوال نہ کرنا۔ جلدی جا"۔

پاداما نے اسے جگر کو چیرنے والی نظروں سے دیکھا اور پھر چلی گئی۔ تن تارارا اس وقت تک اسے دیکھتی رہی جب تک وہ گلی کا موڑ مڑ کر آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ یہ گھڑیاں بڑی کش مکش کی تھیں۔ اب اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے اس کے سر سے بوجھ اتر گیا ہو۔

کچھ دیر بعد ہم باہر نکل آئے۔ میں نے پوچھا۔

"یہ کیا حرکت تھی-----؟"

بولی۔ "جب دل کا ساز بجتا ہے تو دماغ مدہوش ہو جاتا ہے۔ میں کیا کروں۔ تمہاری قربت کے سوا مجھے دنیا کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی"۔

جواب میں میں کچھ نہ بولا۔ اس کا ہاتھ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس لمس میں کتنی سچائی اور عقیدت تھی۔

"سچ کہتی ہوں' مجھے تمہارے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہر جاندار اور بے جان چیز میں مجھے تم ہی دکھائی دیتے ہو۔ کٹیا کے اندر تم' کٹیا کے باہر تم' جنگل کے ایک ایک پتے پر تمہارا گمان ہوتا ہے۔ پہاڑ کے ایک ایک پتھر میں تمہاری آنکھیں جھانکتی نظر آتی ہیں۔ پرندوں کی خوش الحانی میں تمہاری آواز سنائی دیتی ہے اور ان کے پروں کے سنگیت پر تمہاری سانسوں کا گمان ہوتا ہے۔ ذرے ذرے میں مجھے تم دکھائی دیتے ہو---- تم---- تم' تم میری روح میں ایسے رچ بس گئے ہو جیسے پھول کی پنکھڑی میں خوشبو"۔

"تن---- تارا---- را---- اس کا نام لیتے ہوئے میری آواز چاند کی کرنوں کی طرح فضاؤں میں بکھر گئی۔

میں اپنا چہرہ اور آنکھیں نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اپنے احساسات اور جذبات کا

اندازہ لگا سکتا۔ لیکن میرے سینے میں خلوص' پیار' اعتماد اور یقین کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ دنیا میں پیار سے بڑی سعادت کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔

ہاں یہ پیار ہے۔
جو ہر رشتے سے قوی ہے۔
ہر تعلق سے بے نیاز ہے۔
ہر قدر پر بھاری ہے۔
یہ پیار ہی ہے۔
جو ہر دعوے کو جھٹلا دیتا ہے۔
ہر غرور کو توڑ دیتا ہے۔
اور ہر تہمت کو قبول کر لیتا ہے۔

یہ پیار ہی ہے۔۔۔ جو ساگر سے گمبھیر' آکاش سے بلند' کونپل کی طرح نازک' ننھے بچے کی طرح معصوم ہوتا ہے۔

پیار۔۔۔۔ کتنا دلکش لفظ ہے۔ کتنا حسین' دل نشین' جیسے کوئی چنبیلی اور گلاب کی ملی جلی پنکھڑیوں کے ڈھیر پر لوٹتا رہے۔ جیسے کوئی چاند کی کرنوں کا نورانی لباس پہن کر نور بن جائے۔ تن تارارا میرا پیار۔ میں تن تارارا کا پیار۔ یہ نور ہمارے پیار کی علامت ہے اور یہ علامت تن تارارا ہے۔

میں اپنے دیس کی راہ بھول گیا۔۔۔ مگر اس میں میرا کیا قصور۔ نور دیکھ کر بھی کوئی آگے بڑھ سکتا ہے۔ اس زمین پر تو کم از کم ایسا احمق نہیں ہو گا کہ پیار پا لے تو دامن جھٹک کر چلا جائے۔ پیار تو وہ نور ہے جو من کو جلا بخشتا ہے اور روح کو منور کر دیتا ہے۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہم نے بارہا ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا تھا مگر ایسی گھڑیاں پہلے نہیں آئی تھیں۔ پیار پیار کو کس طرح پہچان لیتا ہے۔ میں نے کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ کسی دن یوں غریب الوطن ہو جاؤں گا۔ تقدیر مجھے ایک ایسے اجنبی دیس میں لے جائے گی جہاں کا مذہب' زبان' تمدن او زندگی کی ہر قدر مختلف ہو گی مگر پھر بھی انسان انسان کو پہچان جائے گا۔

میں نے ان آنکھوں میں ہمیشہ خود کو دیکھا۔ صرف تصویر نہیں۔ محض پرچھائیں نہیں۔ میں نے اپنی روح کو وہاں پایا۔۔۔۔ سچ مچ ان گھڑیوں میں میری روح ان آنکھوں میں سے خود مجھے پکار رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

تم ہزار اجنبی بنے رہو۔۔۔۔۔ کروڑوں میل دور چلے جاؤ۔ پاتال تک اتر جاؤ۔ آسمانوں کو مسکن بنا لو۔ کہیں بھی چلے جاؤ' انسان کو انسان سے جدا نہ کر سکو گے۔ پیار کو پیار سے دور نہ کر سکو گے۔

تھوڑی دیر کے بعد تن تارارا کے ابا اور پادااما بھی آ گئے۔ باپ کو دیکھ کر وہ شرارت سے ہنسی۔ مگر یہ ہنسی بے ساختہ نہیں' ساختہ تھی۔ باپ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑا ہو گیا اور اسے گھورنے لگا۔ جیسے واقعی بہت غصے میں ہو۔ تن تارارا اب بھی ہنس رہی تھی مگر میں نے اس کی آنکھوں میں خوف اور گھبراہٹ کی ہلکی سی لرزش دیکھ لی۔ لیکن اس کا باپ زیادہ دیر تک مصنوعی سنجیدگی قائم نہ رکھ سکا اور مسکرا پڑا۔ تن تارارا نے آگے بڑھ کر پیار سے اس کی گردن میں بازو حمائل کر دیے۔

پادااما نے تیکھی اور شریر نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اس کا مفہوم سمجھ گیا اور مسکرانے لگا۔

باپ نے پیار سے اس کے ہلکا سا تھپڑ مارا۔

"شریر کہیں کی۔ اب تو ہمیں اس طرح ستائے گی۔ میں نے پاداما کو بھی مارا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی شرارت ہے۔ بوڑھے ماں باپ کو پریشان کرتی ہے۔ کیا تجھے ہماری محبت پر شک ہے۔ تیری ماں تو رو پڑی تھی۔ خود میرے دل میں جیسے کسی نے دانت چبھو دیے تھے۔ اس پاداما کی بچی کو دیکھو' اب بھی ہنس رہی ہے---- جا اس کی ماں کو ڈھونڈھ لاؤ"۔

پاداما ہنستی ہوئی چلی گئی۔

ابھی باپ بیٹی میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ پاداما تن تارارا کی ماں کو بلا لائی۔ تن تارارا نے ماں کو دیکھا تو فوراً اس کی طرف لپکی۔ لیکن ماں نے ماتھے پر تیوری ڈال کر دور ہی سے اسے روکا۔

"جا ہٹ' بتیسی نہ نکال۔ تیرے دانت اتنے خوبصورت نہیں ہیں"۔

ماں نے گلے نہ لگنے دیا تو تن تارارا نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ باپ ہنس رہا تھا۔ میں بھی محظوظ ہو رہا تھا اور پاداما بھی۔ مگر بڑھیا کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔

"کتیا کی طرح میرے پاؤں میں لوٹنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں سچ کہتی ہوں' مجھے تجھ سے ذرا بھی انس نہیں ہے۔ غلطی سے جنم دیا تو کیا ساری زندگی اس کی سزا بھگتنی ضروری ہے۔ نہ بھئی میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں۔ تیرا جو جی چاہے کر میرا اور تیرا کوئی رشتہ نہیں ہے"۔

"بس اب جانے دو"۔ بوڑھے نے بیٹی کا ساتھ دیا۔ "دیکھو تو معافی مانگ رہی ہے۔ پہلے بھی ایسا گڑگڑائی ہے بے چاری"۔

"میں یہ چونچلے جانتی ہوں۔ نخرہ کر رہی ہے۔ مجھے ایسا لاڈ بالکل پسند نہیں۔ مجھے تو اس پاداما پر بھی بہت غصہ ہے۔ اس نے صبح صبح کتنا جھوٹ بولا تھا---- میرے سفید بالوں کی بھی لاج نہ رکھی اور نہ میری ممتا کا خیال کیا۔ ان کا مذاق کامیاب رہے چاہے دوسرے کی جان چلی جائے۔

پاداما دانتوں میں ہونٹ دبائے ہنستی رہی۔ بڑھیا کے سامنے بولنا آسان نہیں تھا۔ اس سے سب دبتے تھے۔ تن تارارا پاؤں چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور زبردستی ماں سے لپٹ گئی۔

ہم سب تماشا دیکھتے رہے۔ بڑھیا کچھ دیر بڑبڑاتی رہی۔

تن تارارا کبھی چٹکی بجاتی' کبھی گدگدی کرتی' کبھی بوسہ لیتی' آخر تنگ آ کر بڑھیا ہنس دی۔ بڑھیا کے ہنستے ہی پاداما کی رکی ہوئی ہنسی آبشار کی طرح بکھر گئی جیسے پہاڑ پر بندھا ہوا بند ٹوٹ گیا ہو۔

"لو دیکھو یہ کتنی خوش ہو رہی ہے"۔ پاداما کی بے ساختہ ہنسی کی وجہ سے بڑھیا پھر چڑ گئی---- "مگر تجھے بتانا ہو گا' آخر یہ سوجھی کیا؟"

"مجھے کیا پتا ماں۔ تاری ہی سے پوچھو۔ یہی ضد کر رہی تھی"۔

بڑھیا بولی۔

"ہاں جی' اس کی ماں نے بھی بڑی ضدیں کی تھیں۔ ہمیں تو کہیں خواب میں بھی ایسی چھچھوری حرکتیں نہ سوجھی تھیں"۔

بوڑھے کو بھی چھیڑنے میں مزہ آتا تھا۔

"کیوں بے چاریوں کو کوستی ہو۔ اپنا زمانہ بھول گیا ہے۔ وہ یاد ہے نا....."

"تم چپ رہو جی"۔ بڑھیا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "لڑکیوں کے معاملے میں نہ بولا کرو۔ تمہارے ہی لاڈ نے اسے بے راہ کر دیا ہے۔ یہ بہت خود سر ہو گئی ہے"۔

"ماں------!"

تن تارارا نے بے حد لاڈ سے احتجاج کیا۔

"تم مجھ پر الزام لگاتی ہو۔ میں روٹھ جاؤں گی۔ پورے دس روز تک کھانا نہیں کھاؤں گی۔ میری ضد کا تو پتا ہے نا---؟"

"چل ہٹ، ماروں گی"۔ ماں ایک دم نرم پڑ گئی۔ "جاؤ بھاگو۔ کھیلو۔ خبردار آئندہ ایسا کیا تو"۔

تن تارارا اس طرح کی دھمکیاں اکثر دیا کرتی تھی اور بڑھیا موم ہو جاتی تھی۔ کیونکہ وہ تن تارارا کی عادت سے واقف تھی۔ ایک دفعہ ہفتہ بھر اس نے بھوک ہڑتال کر دی تھی۔ یہ میرے آنے سے پہلے کی بات تھی---- تن تارارا اور پاداما بڑھیا کی پسپائی پر ہنسنے لگیں۔

بوڑھے کو پھر موقع ملا۔

"کیوں ری---- ہتھیار ڈال دیے۔ بٹیا تجھے خوب سمجھتی ہے"۔ بڈھا زور زور سے ہنسنے لگا۔ بڑھیا اور چڑ گئی۔

"جاؤ جہنم میں تم بھی، تمہاری بیٹی بھی، بڑا آیا بیٹی والا"۔

"بڑھیا چل دی۔ ہم سب ہنس رہے تھے۔ بڈھے نے ہماری طرف دیکھ کر آنکھ ماری مگر تن تارارا لپک کر بڑھیا سے لپٹ گئی۔ اور اس پر بوسوں کی بارش شروع کر دی۔ بڑھیا کچھ دیر کسمسائی، بڑبڑائی آخر رام ہو گئی۔ بیٹی کو گلے سے لگایا اور پھر بڑے فخریہ انداز سے شوہر کی طرف دیکھ کر بولی۔

"اب بتاؤ، یہ کس کی بیٹی ہے----؟"

بوڑھا زور سے ہنسا۔

"اچھا، اچھا۔ تو ہم اپنے دعوے سے دستبردار ہوتے ہیں ہم نے اپنی بیٹی اپنی بیوی کو بخش دی ہے"۔

"بوڑھا ہنستا مسکراتا چلا گیا۔ تن تارارا باپ کو جاتے دیکھتی رہی۔ بڑھیا نے میری طرف دیکھا۔

"بیٹے------ سات اولادوں کو موت کی نیند سلا چکی ہوں۔ کوئی بھی پانچ برس سے زیادہ نہ جی سکا۔ موت کی بات کر رہی ہوں۔ آسمان بہرا رہے۔ ناگ دیوتا کا سایہ قائم رہے۔ تارارا پیدا ہوئی تو اس کی درازیء عمر کے لئے کیا کیا جتن نہ کئے۔ اب یہ سترہ برس کی ہو رہی ہے۔ یہ ہمارے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور ہے۔ ہم اسے پل بھر کے لئے آنکھوں سے اوجھل نہیں کر سکتے"۔

تارارا کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اسے ماں باپ کی محبت پر ناز اور فخر تھا۔ بڑھیا اسے پیار کر کے بولی۔

"دیکھو نا۔ ناگ دیوتا نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ میری کوئی اولاد بھی اتنی خوبصورت نہیں تھی۔ میری اولاد کیا پورے علاقے میں اس کے حسن کا ثانی نہیں ہے۔ تم یہ نہ سمجھو کہ میں اس کی ماں ہوں اس لئے تعریف کر رہی ہوں۔ اس دیس کے سبھی باسی یہ بات کہتے ہیں"۔

میں نے تن تارارا کی طرف دیکھا اور ماں کی تائید کی۔

"ہاں ماں۔ بالکل ٹھیک ہے۔ صرف یہ دیس ہی کیا وہ دیس بھی جو میں نے دیکھے ہیں، تن تارارا جیسے حسن سے محروم ہیں۔ ماں ایسی لڑکی تو کروڑوں میں ایک ہوتی ہے"۔

تن تارارا نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔ پاداما اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ماں نے فخر و غرور سے اسے سینے سے بھینچ لیا۔

* * *

دوسرے روز شام کو ہم سب کٹیا کے باہر کھانا کھا رہے تھے کہ پاداما آ گئی۔ وہ سیاہ کھال کا لباس پہنے ہوئی تھی اور اس پر سلمہ ستارے کی طرح جگہ جگہ ابرق ٹکی ہوئی تھی۔ اس نے حیرت سے تن تارارا کی طرف دیکھا۔

"اری تو تیار نہیں ہوئی؟"

تن تارارا کھانا چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"بس لباس پہننا ہے۔ تیار پڑا ہے، ابھی آتی ہوں"۔

اس کی ماں چیخی۔

"کھانا تو کھا لے"۔

"بس ماں، اور نہیں کھاؤں گی"۔

وہ لپک کر کٹیا میں چلی گئی۔ آج جگنو ریت کی رات تھی۔ جس طرح چاند چودھویں رات کو پورے شباب پر ہوتا ہے اور یہ پورن ماشی کی رات کہلاتی ہے اسی طرح جب چاند ڈھل جاتا ہے اور اندھیری راتوں میں، سیاہ ترین رات آتی ہے تو یہ جگنو ریت کی رات کہلاتی ہے۔

جگنوؤں کی وہاں بے حد بہتات تھی۔ جونہی شام ہوتی بستیوں کے آس پاس ننھی ننھی جلتی بجھتی شمعوں کا ایک سیلاب امنڈ آتا۔ کروڑوں اربوں کی تعداد میں بالکل خواب کا سا سماں بندھ جاتا۔ در حقیقت وہ جگنوؤں کا دیس تھا۔ رات جتنی زیادہ تاریک ہوتی یہ حقیقت اتنی ہی زیادہ خواب لگتی۔ ایسی رات میں سامنے کے پہاڑ میں سے نیچے کی وادی ایسی لگتی جیسے زمین پر ستاروں کا جلوس نکل رہا ہو۔

تھوڑی دیر میں تن تارارا بھی پاداما کی طرح کا لباس پہن کر آ گئی۔ بڑھیا بولی۔

"اسد بیٹے، تم بھی ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ جگنو ریت آج تم پہلی بار دیکھو گے نا----؟"

"ہاں ماں۔ یہ ریت میں پہلی بار دیکھوں گا۔ میں ضرور جاؤں گا"۔

"اچھی بات ہے--- تاری دیکھنا دوسری بستیوں کے لونڈے اسے پریشان نہ کریں"۔

بڈھے نے فوراً ٹوکا۔

"کیا بات کرتی ہے۔ اسد بڑا پھرتیلا جوان ہے----- بیٹے، لونڈے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ برا نہ ماننا، ہنستے کھیلتے زور آزمائی کا موقع آئے تو ایک آدھ کو زمین دکھا دینا۔ بس پھر کوئی بھی نزدیک نہیں آئے گا"۔

میں ہنس پڑا۔

"آپ اطمینان رکھیں، میں مار کھا کر نہیں آؤں گا"۔

اس رات کے بارے میں تن تارارا مجھے سب کچھ بتا چکی تھی۔ اس

ریت میں صرف کنوارے لڑکے اور لڑکیاں ہی حصہ لیتی تھیں۔ کنواروں کو اس طرح کا موقع بہم پہنچانے کا مقصد یہ تھا کہ تمام بستیوں کے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کو دیکھ پرکھ لیں تا کہ وقت آنے پر لڑکیوں کے انتخاب میں آسانی ہو۔ وہاں شادی لڑکی کی مرضی اور انتخاب پر ہوا کرتی تھی۔

اٹھارہ برس سے پہلے کوئی لڑکی شادی نہیں کر سکتی تھی۔ شادی سے پہلے اگر لڑکے لڑکی سے جنسی فعل کا ارتکاب ہو جاتا اور ان پر جرم ثابت ہو جاتا تو دونوں کو زہریلے سانپ سے ڈسوا کر مروا دیا جاتا۔

جب لڑکی کی عمر اٹھارہ برس کی ہو جاتی تو جگنوؤں کی مالا کی رسم میں لڑکی اپنے شوہر کا انتخاب کرتی۔ اس رسم میں مقررہ دن سب لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے۔ علاقے کا سردار بھی اس رسم میں شامل ہوتا۔ لڑکی اپنے پسند کے نوجوان کے گلے میں مالا ڈال دیتی اور دونوں کی شادی ہو جاتی۔

چنانچہ شادی کی رسم سے پہلے یہ جگنو ریت دونوں صنفوں میں قربت اور پسندیدگی کے مواقع پہنچانے کے لئے منائی جاتی تھی۔ تن تارارا نے مجھے بتایا تھا کہ لڑکے چاروں طرف سے گھیرا بنا لیتے ہیں۔ بیچ میں لڑکیاں ناچتی گاتی ہنستی کھیلتی اور ایک دوسرے سے مذاق کرتی رہتی ہیں۔ چاروں طرف ان گنت جگنوؤں کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ لڑکیوں کے لباس پر لگی ہوئی ابرق پر جگنوؤں کی روشنی پڑتی ہے تو وہ بجلی کی طرح چمکتی اور غائب ہو جاتی ہے۔ بجھتے چمکتے جگنوؤں میں کبھی کسی لڑکی کی آنکھ' کبھی ناک اور کبھی دانت نظر آ جاتے ہیں اور جب کسی لڑکی کے بالوں میں کوئی جگنو الجھ جاتا ہے تو ہر نوجوان لپک کر اسے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں ایک دوسرے سے الجھنے' لڑنے اور زور آزمائی کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو نوجوان پہل کر کے لڑکی کے بالوں سے جگنو نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے' لڑکی اسے بوسہ پیش کرتی ہے۔

بس یہی ایک بوسہ اس ریت کی جان ہوتا ہے۔

جگنو اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ اکثر لڑکیوں کے بالوں میں الجھ جاتے ہیں۔ لیکن اگر بد قسمتی سے کوئی لڑکی محروم رہ جائے تو وہ خود جگنو پکڑ کر اپنے بالوں میں الجھا لیتی ہے۔

اس رات سیاہ گھٹائیں منڈلا رہی تھیں------ رات اور زیادہ تاریک ہو گئی تھی۔ ہوا میں بے حد خنکی تھی۔ تیسری بستی کے وسیع میدان میں یہ ریت ہوا کرتی تھی۔ جگنوؤں کی بہتات بھی وہیں تھی۔ ابھی ہم نے آدھا ہی راستہ طے کیا ہو گا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ پاداما بولی۔

"موسم کے تیور بہت تیکھے ہیں۔ شاید واپس جانا پڑ جائے"۔

میں دعا مانگ رہا تھا کہ بارش نہ ہو۔ پاداما اور تن تارارا کو بھی افسوس ہو رہا تھا۔ مگر آسمان کسی کی کب سنتا ہے۔ بجلیاں یوں چمکنے لگیں کہ کلیجا دہل گیا۔ آسمان کا سینہ پھٹ گیا تھا۔ ہم ایسے بھاگے کہ گھر آ کر سانس لیا۔

میاں بیوی نے کٹیا کے اندر زور کی آگ جلا رکھی تھی۔ میں اور تن تارارا آگ کے قریب بیٹھ گئے۔ پاداما اپنے گھر چلی گئی۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ بڑھیا وہیں آگ کے قریب لیٹ گئی تھی اور اب خراٹیں بھر رہی تھی۔ تن تارارا ماں کے خراٹوں کے قصے مزے لے لے کر بیان کر رہی تھی اور محظوظ ہو رہی تھی۔ بڈھا بھی جمائیاں لے رہا تھا۔ تن تارارا نے مجھے اشارہ کیا۔ وہ مجھے اپنی کٹیا میں جانے کے لئے کہہ رہی تھی۔ ایک مصنوعی جمائی لے کر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ تن تارارا نے باپ کی نظریں بچا کر پھر

میری طرف دیکھا۔

ان میں ایک پیام تھا۔

خاموش اور پر اسرار۔

رات ساری باتوں میں گزر گئی تھی۔ پچھلے پہر کہیں آنکھ لگی تھی' اس لئے سورج طلوع ہونے پر بھی ہماری آنکھ نہ کھلی۔ کواڑ کی کنڈی لگانا نہ مجھے یاد رہا نہ تن تارارا کو۔

تن تارارا کا باپ تو صبح سویرے ہی کسی کام سے نکل گیا تھا مگر اس کی ماں گھر پر تھی اور اس وقت ہماری کٹیا کے دروازے میں کھڑی یہ ہوش ربا منظر دیکھ رہی تھی۔

میرا بایاں ہاتھ تن تارارا کی کمر پر اور داہنا ہاتھ اس کی گردن کے نیچے تھا۔ بڑھیا کی طرف میری پیٹھ تھی۔ تن تارارا کو کوئی سدھ بدھ نہیں تھی۔

سورج کی روشنی کٹیا کے اندر آ گئی تھی۔ میں نے کسمسا کر آنکھ کھولی اور دروازے کی طرف دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ ہڑ بڑا کر اٹھا تو تن تارارا کی آنکھ بھی کھل گئی۔ ماں کو دیکھ کر وہ سہم کر پیچھے ہٹی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ماں سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ ایک گھمبیر حسرت کے سوا اس کے چہرے پر دوسرا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے تکے جا رہی تھی مگر یہ بڑی بلیغ بے زبانی تھی۔ سینکڑوں گلے اور ہزاروں شکوے ایک طرف اور یہ خاموشی ایک طرف۔

پھر وہ چلی گئی---- کچھ کہے سنے بغیر---- ہم دونوں اسی طرح سہمے ہوئے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ میں نے تن تارارا کی طرف دیکھا وہ زمین کو گھور رہی تھی۔ اب اس کے چہرے سے خوف کے اثرات زائل ہو رہے تھے اور ایک پر اسرار خود اعتمادی نمایاں ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں کسی نئے ارادے نے جنم لیا ہو۔

خود میں ایک عجیب کش مکش سے گزر رہا تھا۔ میری شخصیت کو دھچکا لگ چکا تھا۔ میرا وقار مجروح ہو گیا تھا اور میرا قد سکڑ گیا تھا۔ اب اس گھر میں بڑھیا سے آنکھ ملانے کی ہمت میں کہاں سے لاؤں گا۔

تن تارارا کی نظریں بدستور زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ شاید میں اسے تسلی دینا چاہتا تھا۔ جھوٹی تسلی۔

وہ کچھ نہ بولی اور نہ اس کے چہرے پر اس کا رد عمل ہی ظاہر ہوا۔ وہ اپنے آپ سے بر سرپیکار تھی۔ اپنے ہی ضمیر سے جنگ کر رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں کسی فیصلے پر پہنچنے کی چمک لرزاں تھی۔ کافی دیر تک ہم یونہی بیٹھے رہے اور جانے کتنی دیر تک بیٹھے رہتے کہ پادابا کی چیخ نے ہمیں چونکا دیا۔ میں لپک کر باہر نکلا۔ پادابا دوسری کٹیا کے دروازے میں سہمی ہوئی کھڑی تھی میں دوڑ کر اندر گیا۔

آہ بد نصیب بڑھیا۔

گوشت کاٹنے والا چھرا اس کے پیٹ میں پیوست تھا اور وہ خون میں لت پت پڑی تھی۔

میں نے لپک کر چھرا اس کے پیٹ سے نکالا اور اسے ٹٹولا۔ جھنجھوڑا---- مگر نہیں-----

ہر لمحے ہنستی کھیلتی بڑھیا ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روٹھ گئی تھی۔ میں اس کی لاش سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اتنے میں تن

تارارا بھی پہنچ گئی اور چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں ساری بستی جمع ہو گئی۔ سب حیران اور پریشان تھے۔ بڑھیا کی خود کشی کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

شام تک بوڑھا بھی لوٹ آیا۔ اس نے ٹھنڈے دل سے بڑھیا کی خود کشی کا واقعہ سنا۔ وجہ اسے کوئی بھی نہ بتا سکا۔ وہ برداشت اور تحمل سے بڑھیا کی لاش کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

چند لمحے بے حد پیار سے دیکھتا رہا۔ پھر بوجھل آواز سے بولا۔

"تم نے تو زندگی کا کوئی راز مجھ سے چھپا کر نہ رکھا تھا۔ پھر اپنی موت کو یوں پراسرار بنا کر کیوں چلتی بنیں۔۔۔۔۔؟ تم نے تو مجھ سے اپنی میت کو دودھ میں نہلانے کا وعدہ لیا تھا۔ پھر تم نے خون کا یہ رنگین کفن کیوں پہنا۔ میں سمجھتا ہوں، تم نے سخت مجبوری کے عالم ہی میں یہ قدم اٹھایا ہو گا۔ ورنہ تم وعدہ توڑنے والی عورت نہیں تھیں۔ میری اچھی ساتھی۔۔۔۔ تمہاری کوئی بات آج تک میرے لئے بار خاطر نہیں ہوئی۔۔۔۔ گو تمہاری موت نے مجھے سوگوار کر دیا ہے مگر تمہارے فیصلے پر میں حرف گیری نہیں کروں گا۔۔۔۔ میں تمہاری موت کو گلے لگا رہا ہوں یہی تمہاری امانت ہے"۔

تن تارارا اب کچھ سنبھل گئی تھی۔ بوڑھا بوجھل قدموں سے اٹھا، بیٹی کے سر کو چوما اور باہر نکل گیا۔

بڑھیا کی تجہیز و تکفین ہو گئی۔

تن تارارا کا خیال ہو گا کہ اس غم میں میں اس کا حصہ بٹاؤں گا۔ لیکن جب اسے اپنے حصے کی تسلی نہ ملی تو وہ میری گود میں تڑپ تڑپ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔

تب میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ دراصل ہم دونوں کا غم ایک تھا اور تسلی بھی سانجھی تھی۔

اس نے روتے روتے ایک عجیب بات کہی۔

"مرنا تو دراصل مجھے تھا مگر ماں نے پہل کر دی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی بیٹی شرمندگی کا اتنا بڑا بوجھ نہ اٹھا سکے گی اور یقیناً" زندگی پر موت کو ترجیح دے گی۔ دراصل اس نے مجھے زندہ رکھنے کی خاطر اپنی زندگی کی قربانی دی ہے"۔

بات کسی حد تک ٹھیک تھی۔ زندگی تک ان لوگوں کی رسائی ہماری مہذب دنیا سے بالکل مختلف تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی گفتگو کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ زندہ رہنے کا جواز ڈھونڈھ رہی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اس نے ہچکیاں لیتے لیتے سر اٹھایا۔

"تم نہیں جانتے ہمارے دیس میں لڑکیاں چوری چھپے اپنے چاہنے والوں کو بوسہ نہیں دیتیں۔ یوں تم سب کے سامنے میرا بوسہ لے سکتے ہو اسے کوئی برا نہیں سمجھے گا۔ لیکن بوسے کو چھپانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لڑکی اپنی کنواری عزت سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔ پردیسی، میں بری لڑکی نہیں ہوں، تم جانتے ہو اور آگے چل کر تم اور زیادہ محسوس کرو گے۔۔۔ کہ میں واقعی بری لڑکی نہیں ہوں۔۔۔۔۔ مگر میں کیا کروں۔ میں باؤلی جو ہو گئی ہوں۔ تمہارے پیار نے مجھے اندھا کر دیا ہے۔ میں نے اپنے دیس کی روایات کو توڑا ہے۔ شاید میں ہی وہ پہلی احمق لڑکی ہوں جس نے ناگ دیوتا کے غضب کو للکارا ہے۔ ماں مر گئی۔ شاید میں بھی مر جاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ مجھے سنسار کر

دیں۔ آگ میں ڈلوا دیں۔ ناگ دیوتا سے ڈسوا دیں۔ مگر میں اپنی کمزوری پر غالب نہیں آ سکتی۔ میں تم سے دور نہیں رہ سکتی"۔

میں نے اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ سچائی کا اتنا انوکھا روپ میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔



بڑھیا کی موت کو ایک مہینہ ہو گیا تھا مگر تن تارارا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہر نہ آئی۔ اس کی سوگوار آنکھوں میں ہزاروں حسرتیں تھیں۔

میں اسے تسلی دیتا تو وہ بے اختیار رو پڑتی اور میرے سینے سے لگ جاتی اور تب تک مجھ سے الگ نہ ہوتی جب تک اس کے دل کی بھڑاس نہ نکل جاتی۔ رونے سے اس کا اعصابی اور جذباتی کھچاؤ بھی کم ہو جاتا۔ ایسے میں وہ ماں کی یادوں سے دل بہلاتی اور اس کی باتوں کو دہراتی۔ یوں لگتا جیسے وہ ہوا میں لفظوں کے دیپ روشن کر رہی ہے۔ ان دیپوں کا عکس اس کی آنکھوں میں صاف دکھائی دیتا تھا۔ ماں۔۔۔۔۔۔ جس کے خون سے اس کا وجود بنا تھا' جس نے اسے جنا تھا اور جو اس کی خاطر مر گئی تھی۔

اس نے کہا تھا:

"ماؤں کا تو کام ہی یہ ہے کہ اپنی اولاد پر قربان ہو جائیں"۔

شاید میری نانی میری ماں کے لئے اور میری پڑ دادی میری دادی کے لئے

مری ہو گی---- میں بھی کسی دن اپنی اولاد کے لئے جان دے دوں گی!"

میں نے اس کے گھنگھریالے بالوں کو اپنی انگلی پر لپیٹتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

"تن تارارا۔ تمہاری اولاد کا باپ کون خوش نصیب ہو گا؟"

اور مجھے اس کا جواب آج بھی یاد ہے۔ اس نے کہا تھا۔

"تم نے یہ سوال ایسے موقع پر کیا ہے جب میں ماں کے غم میں سوگوار ہوں۔ تم یہ سوال اس وقت کرتے جب میں غم زدہ نہیں تھی تو تمہیں بہت حسین جواب دیتی۔ میں اب بھی تمہیں خوبصورت جواب دوں گی۔ مگر تمہیں اس سوال کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"تارو----!"

میں نے بے حد نرمی اور پیار سے کہا تھا۔

"اگر اس ضرورت کو واضح کرنا میرے لئے لازمی ہے تو یہ میری بدقسمتی ہے۔ اس کی وجہ تو تمہیں خود جان لینا چاہئے تھی"۔

"ہاں۔ میں یہ وجہ جانتی ہوں۔ اس لئے تمہاری طرف سے بھی اس سوال کی ضرورت نہیں سمجھتی تھی"۔

میں نے اس کے چھلے دار بالوں میں سے انگلی نکال لی تھی اور نہایت عقیدت سے اس کے بالوں پر ہونٹ رکھ دیئے تھے۔ یہ لڑکی اپنے الجھے ہوئے بالوں کی طرح الجھی ہوئی ہرگز نہیں تھی۔ اس کے کردار کے متضاد پہلو ضرور تھے۔ لیکن ہر پہلو کا دھارا پیار کے آب حیات سے جا ملتا تھا۔

اگلے روز میں اسے بہلا پھسلا کر پہاڑی پر لے گیا اور عمداً" میں اس طرف گیا جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔ اس کا نتیجہ حسب منشا نکلا۔

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ پھیل گئی۔

ماں کی موت کے بعد اس کے لبوں پر یہ پہلا تبسم تھا۔

وہ بولی۔

"ہم یہیں ملے تھے نا----؟"

"ہاں تارو۔ یہ وہی جگہ ہے۔ میں جان بوجھ کر تمہیں یہاں لایا ہوں"۔

اس کی مسکراہٹ کچھ اور زیادہ نکھر گئی۔ اس کے خوبصورت نیلگوں سفید دانت چمک رہے تھے۔

"پردیسی"۔

اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"تم مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو میں خوش رہوں گی۔ عہد کرنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ تم میرے من کی گہرائیوں کو جانتے ہو----

"تم میرا ایمان ہو اور ایمان بدلنے والی چیز نہیں ہوتی"۔

ماں کی موت کے بعد وہ ہر لمحہ جذباتی ہو جاتی تھی۔ اس کی روح اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ برہنہ ہو گئی تھی۔ شدید قسم کی سچی محبت کرنے والی عورت بالکل فرشتے کی طرح لگتی ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

"تم جا کر انار کے اس پیڑ پر بیٹھ جاؤ۔ میں یہاں انار کھاتا ہوں' پھر تم مجھے اچانک اس طرح مخاطب کرو جیسے تم نے پہلی بار کیا تھا"۔

وہ ہنس پڑی اور پیڑ پر جا بیٹھی۔ میں انار کھاتا رہا اور کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ چلائی۔

"نہیں نہیں۔ تم تو مجھے چوری چوری دیکھ رہے ہو۔ اس روز ایسا کہاں ہوا

تھا؟"۔

میں نے کہا۔

"اچھا بھئی اچھا' ہم نہیں دیکھتے ہم انار کھا رہے ہیں"۔

تھوڑی دیر بعد وہ چلائی۔

"ہے۔۔۔"

میں چونکا۔ تو وہ فوراً" بولی۔

"ری!"

میں نے فوراً" ٹوکا۔

"نہیں بھئی ایسا نہیں تھا۔ اس روز "ہے" کہنے کے بعد تم نے مجھے چند لمحے گھورا تھا۔ اس کے بعد پیڑ سے اتر آئی تھیں اور پھر کہا تھا۔ "ری"۔

"اچھا' تمہیں تو ایک ایک بات یاد ہے۔ ہے نا۔۔۔؟"

"کیوں نہیں۔ اس کے بعد تم نے بام چانگا ماں۔ بام چانگا ماں کہا تھا۔ ہے نا؟"

"ہوں"۔

اس نے ہونٹ دبائے اور پھر ہاتھوں کا بھونپو بنا کر زور سے "بام چانگا ماں' بام چانگا" ماں کی صدا لگائی۔

ہم دونوں ہنس رہے تھے کہ یک لخت درختوں کے جھنڈ میں سے سردار کا بیٹا نمودار ہوا۔ قدم جما جما کر رکھنے سے اس کے جذباتی اتار چڑھاؤ کا اظہار ہوتا تھا۔

وہ ہمارے قریب پہنچ کر رک گیا۔ چند لمحے تن تارارا کو گھورتا رہا۔ مگر تن تارارا نے آنکھ نہ جھپکائی۔ یہی اس کے خاموش حملے کا جواب تھا۔۔۔۔ اب

اس نے میری طرف دیکھا اور ہونٹ چبانے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کا ارادہ کیا ہے۔ معاً" وہ آگے بڑھا مگر تن تارارا لپک کر ہمارے درمیان آ گئی۔

سردار کے بیٹے نے اسے دھکیل کر پرے کیا اور ایک زور دار مکا میری گردن پر رسید کیا۔ میں لڑکھڑا کر گر پڑا۔

تن تارارا سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ میں بھی اب سنبھل گیا تھا۔ میں نے لپک کر اس کی گردن پکڑ لی اور ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس کا جسم گٹھا ہوا اور تنو مند تھا لیکن تن تارارا کے سامنے ہار میری توہین تھی۔ بس ایک انجانی سی قوت تھی جو میرے جسم میں بھر گئی تھی مگر ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہم دونوں تھک گئے تھے۔ دونوں کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ اور اب کسی میں مزید لڑنے کی ہمت نہیں تھی۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ تن تارارا جو خوف اور بے چینی سے لڑائی دیکھتی رہی تھی' میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور میرے پسینے سے شرابور بازوؤں کو سہلانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں فخر اور غرور کی چمک تھی۔

اور پھر سردار کا بیٹا لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور ڈگمگاتے قدموں سے بستی کی طرف چلا گیا۔

ہاری ہوئی تن تارارا بالکل ہی ہار گئی۔ اس کے لئے یہ انکشاف تعجب کی بات تھی کہ میں ان وحشیوں سے بھی دو دو ہاتھ کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ اس کی بے پناہ گرویدگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسی دنیا میں پہنچ چکی ہے جہاں سے اسے لانا اب کسی کے بس کا روگ نہیں۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں میں نے اس آہوئے ختن کو پایا تھا۔۔۔ "ہے" کہہ

کر جس نے آسمانی ندا سے مجھے زندہ رہنے کی نوید دی تھی۔ "ساتی رو" کہہ کر جس نے مجھے اپنے دامن میں پناہ دی تھی۔ اور "ری" کہہ کر مجھے جنگلی انسانوں کی بستی میں لے گئی تھی۔

میری سانس اب معمول پر آ گئی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ بے حد خوش تھی۔۔۔۔ میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور وہ ریشم کے ڈھیر کی طرح میرے سینے کے ایوان میں جا گھسی۔

اس کا ہر قرب ایک نیا رنگ' نیا روپ اور نیا کیف لے کر آتا تھا۔

آہ۔۔۔۔ کتنی گرمی' کتنی تڑپ' کتنی ترنگ اور کتنا نشہ تھا اس قرب میں۔

اس نے میری چھاتی سے منہ لگا رکھا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ ہولے ہولے تھرک رہے تھے۔ اس کے گرم گرم لبوں کی گرمی میرے سینے میں تحلیل ہو رہی تھی اور میری روح میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ اس کی مرمریں گردن پر میری انگلیاں تھرک رہی تھیں۔

نہ اسے سدھ بدھ تھی نہ مجھے۔ یہ احساس ہی نہ رہا تھا کہ میں نے خود کو اس کے حوالے کیا ہے یا اس نے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا ہے۔

جانے کتنی دیر ہم یونہی ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ صدیوں کے احساس سے سرشار لمحے۔

زندگی ایک شاداب درخت ہے اور یہ لمحے امر پھل ہیں۔ یہ ثمر چکھ کر زندگی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔

سردار کا بیٹا جا چکا تھا۔ مگر رد عمل کے طور پر چند نئے جذبے چھوڑ گیا تھا۔۔۔۔ بڑے میٹھے' رسیلے اور گداز۔۔۔۔

"چلو گی نہیں تارا۔۔۔۔؟"

میں نے بے حد نرمی اور پیار سے پوچھا اور اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اوپر اٹھایا اس کے گیلے گیلے غلافی پپوٹے۔۔۔۔ میں نے ایک کو چوما۔ پھر دوسرے کو لیکن سوئے ہوئے کنول پھر بھی نہ کھلے۔

"اٹھو۔ آنکھیں کھولو"۔

اس نے دھیرے سے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی نیم وا آنکھوں میں صدیوں کے خمار کا پرتو تھا۔

ہائے! دنیا میں محبت سے زیادہ شہ زور چیز کوئی نہیں۔۔۔۔۔ دریاؤں کو بند باندھ کر روکا جا سکتا ہے۔ سمندروں کا احاطہ ہو سکتا ہے۔ سر بفلک چوٹیوں کو سر کیا جا سکتا ہے۔۔۔۔ مگر محبت کے سرکش گھوڑے کو آج تک کوئی لگام نہ لگا سکا۔

بے چارہ سردار کا بیٹا۔

☆

ایک دن تن تارارا نے مجھے خوش خبری سنائی۔

"دیکھو پردیسی' جب سے تم آئے ہو یہاں جگنو ریت ہی نہیں ہوئی"۔

"ہاں۔۔۔۔" میرا لہجہ ایک دم سوالیہ ہو گیا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

"ارے وہ اپنی پادانا کی بچی ہے نا۔ مجھ سے ایک مہینہ بڑی ہے"۔۔۔۔۔ تن تارارا مچل مچل گئی۔ "مجھے بتایا تک نہیں۔ پرسوں اس کی جگنو ریت ہے۔ وہ پورے اٹھارہ برس کی ہو جائے گی"۔

"اچھا۔۔۔۔؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"تو اور کیا۔ بڑی سوریا ہے"۔ تن تارارا کی گالی میں بڑا پیار

تھا----- سمجھتی ہو گی کہ میں اسے تنگ کروں گی- پوچھوں گی کہ مالا کس کے گلے میں ڈالو گی؟"-

"کیوں---- تمہیں بتانے میں کیا حرج تھا؟"-

"واہ---- تم بہت سیدھے ہو- رسم کا مزہ ہی اسی میں ہے کہ ایک حد تک خود کو بھی علم نہ ہو----- بس جو من کو بھا جائے بجلی سی کڑک جائے- الہام سا ہو جائے اور آدمی ایک انجانی سی قوت کا سہارا لے کر کسی کا ہو جائے---- کسی کو اپنا لے"-

تن تارارا جذباتی ہو گئی تھی-

میں نے پوچھا-

"اتنا اچانک فیصلہ صحیح بھی ہو سکتا ہے تارو؟"

"ہاں-" وہ بڑے نرم مگر پر اعتماد لہجے میں بولی-

"من پر کوئی کیسے بھروسہ نہ کرے"-

بات ٹھیک تھی- من پر کوئی کیسے بھروسہ نہ کرے- صاحب عقل ہونا اچھی بات سہی مگر صاحب دل ہونا اس سے بھی اچھی بات ہوتی ہے-

میں نے کہا-

"تارا---- بڑی رومانی رسم ہے---- بڑا مزہ آتا ہو گا- ہر نوجوان کا دل دھک دھک کرتا ہو گا"-

"ارے کیا بتاؤں' بعض تو خود کشی کر لیتے ہیں- لڑکی خوبصورت ہو تو مہینوں پہلے لڑکے کی ماں اور بہنیں لڑکی کو متاثر کرنے کی کوشش کرتی ہیں- منت سماجت کرتی ہیں' سبز باغ دکھاتی ہیں- لڑکیاں ہاں کر دیتی ہیں- وعدے بھی کر لیتی ہیں مگر وقت آنے پر وہی کرتی ہیں جو اُن کے من میں ہوتا ہے"-

میرے ذہن میں ایک اور سوال ابھرا-

"لڑکے خود کوشش نہیں کرتے؟"

"ناک سے لکیریں کھینچتے ہیں' گڑگڑاتے ہیں' روتے ہیں' پاؤں پڑتے ہیں- ناگ دیوتا کی قسمیں کھاتے ہیں- ساری زندگی غلام رہنے کے وعدے کرتے ہیں"-

"خوب! تو گویا اس دیس میں حکومت عورت کی ہے؟"-

"ہاں---- یہ ناگ دیوتا کا قانون ہے- مادہ زندگی کو جنم دیتی ہے اور اسے اپنا خون پلاتی ہے- وہ نر سے پہلے بوڑھی ہو جاتی ہے' اس لئے اس کی خوشی کو مقدم سمجھا گیا ہے"-

میں نے پوچھا-

"تو پھر پادا ما نے تمہیں کچھ بتایا بھی؟"

واہ---! کہہ تو دیا بڑی سنوریا ہے' ہزار پوچھا' منتیں کیں' دھمکایا' روٹھی بھی مگر وہ ہنستی رہی- اس کی آنکھیں روشن تھیں- کوئی ان میں جھانک رہا تھا- جانے کون تھا وہ----؟

"اچھا- تو کسی سے محبت کرتی ہے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا-

"لو---- یہ کوئی حیرت کی بات ہے بھلا کوئی لڑکی محبت کے بغیر بھی جی سکتی ہے- تم نرے اناڑی ہو پردیسی- کبھی کبھی بڑے بھولے لگتے ہو"-

میں ہنس پڑا-

"مجھے زندگی کا اتنا وسیع تجربہ کہاں ہے تارو- میری عمر ہی کتنی ہے- سکول چھوڑا' فوج میں چلا گیا اور فوج سے سیدھا یہاں"-

تجربہ کار تو میں بھی نہیں ہوں- مگر پیار کے لئے تجربے کی کیا ضرورت

ہے۔ یہ کوئی سکھانے سے تھوڑا ہی آتا ہے۔ یہ تو ذاتی جذبہ ہے جو بن بولے‘ بن سمجھے اور بن بلائے جکڑ لیتا ہے۔ رونا اور ہنسنا کوئی نہیں سکھاتا---- پیار کی بھی یہی حالت ہے۔ یہ ہماری اپنی چیز ہے یہ تجربوں کا محتاج نہیں“۔

میں نے اسے چوم لیا۔

وہ گھمبیر ہو گئی۔

کوئی اس کی آنکھوں میں بھی جھانک رہا تھا۔

میں نے اس کے سرخ ہونٹوں پر دھیرے سے انگلی پھیری۔

”یہی ہے نا وہ پیار جو ہماری اپنی چیز ہے جو لہو کی طرح ہمارے جسم میں رواں دواں ہے جو تجربوں کا محتاج نہیں“۔

وہ چپ رہی۔

محجوب سی۔

پیار اپنے اظہار کے لئے لفظوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں میں جذبات کے قندیل روشن تھے۔

یہ آنکھیں کس قدر سچائی اگلتی ہیں۔

کوئی کچھ نہ بولے مگر اظہار کا نور ان میں کھنچ آتا ہے۔

کائنات کی تمام بہاریں اس کی آنکھوں میں سما گئی تھیں۔

بغیر آنکھ جھپکائے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اس نے میری چھاتی پر سر رکھ دیا۔

جیسے میرے جسم میں تحلیل ہو گئی ہو۔

* * *

آج پاداما کی جگنو مالا ریت تھی۔

تن تارارا صبح تڑکے اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔ گاؤں کی ساری کنواریاں س کے گھر جمع تھیں۔ آج انہیں سارا دن کھیلنا‘ کودنا‘ ناچنا اور پاداما کو دلہن بنانا ھا۔ تن تارارا کہہ گئی تھی کہ وہ شام کو سردار کی بستی میں ملے گی۔

یہ رسم بھی وہیں ہونی تھی۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں مجھے سردار کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ آج یہاں بے پناہ چہل پہل تھی۔ تمام بستیوں کے بچے‘ بوڑھے اور جوان امنڈ آئے تھے۔ اداما خوبصورت لڑکی تھی۔ بہت سے جوانوں کے دل میں اس کی چاہ ہو گی۔ امنے سردار کا تخت پڑا تھا۔ اس پر شیر کی دو کھالیں اس طرح بچھی ہوئی تھیں کہ سردار تخت پر بیٹھے تو دونوں شیر کے سر اس کے پاؤں تلے آئیں۔ یہ سردار ی عظمت کا ایک ذریعہ اظہار تھا۔

سردار کے دائیں جانب بچے بوڑھے اور شادی شدہ لوگ تھے۔ بائیں

جانب زندگی سے بھرپور کنواریوں کا اژدحام تھا۔

تخت کے بالکل سامنے مختلف کھالوں کے لباس پہنے نوجوانوں کا ہجوم تھا۔

پاداما نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی تھی۔

چاروں طرف مشعلیں روشن تھیں۔

معاً ایک آواز نے سب کو چونکا دیا۔

"ری شمبو ری شمبو"۔

یہ سردار کی آمد کی اطلاع تھی۔ مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ سب لوگ دست بستہ سرنگوں ہو گئے۔ سردار بڑے وقار سے مسکراتا ہوا تخت پر بیٹھ گیا۔ اس کا لڑکا اس کے ساتھ تھا۔

"سنگتا سنگتا"۔

سردار نے ہاتھ ہلا کر مجمع کو خطاب کیا۔ اس پر لوگوں نے زور سے خوشی کا نعرہ لگایا اور پھر سے وہی چہل پہل لوٹ آئی۔ اتنے میں چار آدمیوں نے ایک تخت سردار کے سامنے رکھ دیا اور پھر بڑے احترام سے پیچھے ہٹ گئے۔ تخت پر ایک بڑی سی پٹاری رکھی ہوئی تھی، جس پر لومڑی کی نرم کھال منڈھی ہوئی تھی۔ پٹاری میں ناگ دیوتا بند تھا۔

اب مجمع میں کچھ نظم پیدا ہو گیا تھا۔ سب خوش تھے اور سردار کی طرف اشتیاق بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اسی لمحے سردار نے رسم شروع کرنے کا اشارہ کیا جس پر لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں اور سب کی نظریں کنواری لڑکیوں کے ہجوم پر جم گئیں۔

پاداما سر جھکائے، شرماتی لجاتی، لڑکیوں کے جھرمٹ سے نکلی۔ اس نے چیتے کی کھال کا خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ پاؤں اور ہاتھوں میں سفید پھولوں کے گجرے تھے۔ بالوں میں جگہ جگہ جگنو الجھا دیے گئے تھے۔ جگنو اپنی دمیں پروں سے رگڑتے تو روشنی کی ایک رمق سی پھوٹتی اور پھر بجھ جاتی۔ اس خواب آگین ماحول میں وہ پرستان کی کوئی شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔

پاداما ناگ دیوتا کے سامنے دو زانو ہو گئی۔ اس نے پٹاری کا ڈھکنا ہٹایا تو ایک سفید چمکیلے ناگ نے پھن پھیلا کر سر اٹھایا۔ سردار سمیت سب لوگوں کے سر عقیدت سے جھک گئے۔

یہ ناگ چاندی کی طرح چمکیلا تھا۔ میں نے پہلی بار اس طرح کا خوبصورت ناگ دیکھا تھا۔ اس سے روشنی پھوٹی پڑتی تھی۔ کہتے ہیں یہ سانپوں کا بادشاہ ہوتا ہے۔

پاداما دست بستہ سرنگوں تھی۔ مجمع پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ناگ چند لمحے پھن پھیلائے لہراتا رہا۔ اس کی سنہری زبان شعلے کی طرح اندر باہر ہوتی رہی۔ پھر آہستہ سے اس کا سر پٹاری میں غائب ہو گیا اور پاداما نے پٹاری کا ڈھکنا بند کر دیا--- اس پر مجمع نے ایک بار پھر خوشی سے تالیاں بجائیں۔

یہ پاداما کی خوش نصیبی کی دلیل تھی کہ ناگ دیوتا درشن دے کر یوں جلدی سے غائب ہو گیا۔ یہ ایک قسم کا اجازت نامہ تھا، ورنہ جب تک ناگ دیوتا پھن پھیلائے نظر آتا رہے کسی کی مجال نہیں کہ ذرا سی حرکت بھی کرے۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ ناگ دیوتا ناراض ہو جاتا۔ اس وقت تمام مجمع بے حس و حرکت پہروں سرنگوں کھڑا رہتا۔ جب کبھی ایسا ہوتا تو شادی کی کامیابی کو مشکوک سمجھا جاتا۔

اب پاداما اٹھی اس نے سردار کے تخت کو بوسہ دیا۔ سردار نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پاداما پیچھے ہٹی اور پنڈال کے وسط میں پہنچی، مختلف

قسم کے ساز بجنے لگے اور اس نے ناچ شروع کر دیا۔

میں گمان نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اس قدر تند و تیز لڑکی نکلے گی۔ اس کی نس نس میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ انگ انگ مچل رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی آسمانی مخلوق زمین پر اتر آئی ہے اور دیکھتے دیکھتے اپنے ملکوتی پروں کے سہارے فضاؤں میں تحلیل ہو جائے گی۔

سیماب کی طرح تڑپا دینے والا یہ ناچ ---- کون سکھا گیا ہے؟ یہ انسانی دماغ کا کرشمہ نہیں تھا۔ یہ ذہانت اور فطانت کی بات بھی نہیں تھی۔

میں تو اسے بس ایک جذبہ کہہ سکتا ہوں ---- اپنی محبت سے ہم کنار ہونے کی سچی خوشی اور رد عمل کے اظہار کا فطری جذبہ۔ یہ الہامی رقص تھا۔ جس میں سرور تھا' سرشاری تھی' سرمستی تھی' وجدانی کیفیت تھی۔ بس یوں سمجھئے کہ یہ ناچ........ ایک احساس تھا جو تن من میں دیوانگی کی حد تک والہانہ خوشی کی لہر دوڑا رہا تھا ---- شاید برسوں کی ریاضت کے بعد انسان اس طرح کی لا زوال مسرت سے دو چار ہوتا ہو۔ میں کہہ نہیں سکتا۔

میری طرح شاید اور لوگوں نے بھی رقص کا یہ والہانہ انداز پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کسی کی آنکھ سے خوشی کے آنسو گر رہے تھے۔ کوئی تھر تھر کانپ رہا تھا اور کچھ اس طرح مبہوت کھڑے تھے جیسے ان کی روح ناچ کے زاویوں میں تحلیل ہو گئی ہو۔

خود سردار دم بخود تھا۔

ہر آدمی اپنے طور پر ایک خاص کیفیت سے سرشار تھا۔

فن کوئی بھی ہو ---- جب سچی لگن کے ساتھ آتا ہے تو دلوں کو موہ لیتا ہے۔

تن تارارا کی محبت کے بعد یہ دوسرا تاثر تھا جو میری روح کو گدگدا گیا تھا۔

تقریباً" ایک گھنٹے تک یہ طلسمی رقص جاری رہا۔ آخر میں پاداما ناچتے ناچتے سردار کے سامنے جھک گئی۔ ساز خاموش ہو گئے۔

لوگوں نے داد کے طور پر تالیاں نہیں بجائیں۔ اس طرح کا خراج عقیدت بہت رسمی ہوتا۔ وہ تو اپنی روحیں نثار کر چکے تھے اور اب لاشوں کی طرح گم سم کھڑے تھے۔

سردار نے بڑی گرم جوشی اور تپاک سے پاداما کی پیشانی چومی۔ یہ بھی عام روایات سے ہٹ کر بات تھی۔

اسی لمحے میری نگاہ تن تارارا پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں رشک کے آنسو تھے۔

سردار نے جگنوؤں کی ایک مالا پاداما کے ہاتھ میں تھما دی۔ ایک سیاہ باریک دھاگے میں بہت سے جگنو پرے ہوئے تھے۔ پاداما مسکرا کر اٹھی اور جلتے بجھتے جگنوؤں کی مالا ہاتھ میں لے کر کنوارے نوجوانوں کی طرف بڑھی۔

نوجوانوں کے دل دھڑکنے لگے۔ کچھ تو گھبراہٹ کی وجہ سے پیلے پڑ گئے تھے اور کچھ ہیجانی کیفیت کے زیر اثر سرخ ہو گئے تھے۔ پاداما حسین تو تھی ہی ---- مگر چند لمحے پہلے اپنے ناقابل فراموش رقص کی وجہ سے انمول ہو گئی تھی' اس لئے کنواروں کا یہ رد عمل بالکل فطری تھا۔ سب پاداما کی شخصیت سے مرعوب نظر آ رہے تھے اور وہ ان کی اس کیفیت سے محظوظ ہو رہی تھی۔ ایک ایک نوجوان کے پاس جا کر رکتی' دیکھتی' مسکراتی۔ پہلے اسے تذبذب میں ڈالتی پھر اسے مایوس چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی۔

اس پر سب لوگ ہنستے۔

ایک بار تو اس نے ایک نوجوان کے گلے میں مالا ڈالنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھائے بھی۔ لیکن جب اس نے مالا پہننے کے لئے سر جھکایا تو وہ ہاتھ کھینچ کر پیچھے ہٹ گئی۔۔۔۔ اس پر زور کا قہقہہ پڑا۔ نوجوان کھسیانا ہو کر رہ گیا۔

آخر میں وہ ایک نوجوان کے سامنے آ کر رک گئی۔

یہ نوجوان بڑی خود اعتمادی سے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پیار تھا اور انداز میں فتمندی کی جھلک۔

پاداما کے چہرے کی رنگت بھی بدل گئی تھی۔ وہ بڑی عقیدت سے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ان لحوں میں اس نے آنکھ تک نہ اٹھائی۔

مالا اس کے ہاتھ میں تھی اور ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس کپکپاہٹ کے معنی سب کی سمجھ میں آ گئے تھے۔ معاً اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ اٹھے' نوجوان کا سر جھکا اور جگنوؤں کی ٹمٹماتی مالا نے دونوں کو ایک دوسرے کا جیون ساتھی بنا دیا۔

نعرے بلند ہوئے۔۔۔ شور مچا۔۔۔ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ نوجوان نے از خود رفتگی کے عالم میں اسے گلے سے لگایا اور دیر تک دنوں آنکھیں بند کئے خود فراموشی کے عالم میں ایک دوسرے سے چپٹے کھڑے رہے۔

دوسرے نوجوان بھی اس مسرت اور انبساط میں شامل تھے۔ رقابت کی کوئی لہر' شکست کا کوئی تاثر ان کے چہروں پر نہیں تھا۔

شور و غل دھیرے دھیرے معمول پر آ گیا۔ پاداما اور اس کا محبوب ناگ دیوتا کی پٹاری کے پاس آئے اور بڑی عقیدت سے پٹاری کو چوما۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نوجوان نے رسم کے مطابق اس کے ہونٹ چومے۔ یہ سب کے سامنے زندگی بھر ساتھ رہنے کا عہد و پیمان تھا۔

میں سوچ رہا تھا۔۔۔۔ یہ بوسہ' یہ لحہ۔۔۔ پاداما کی زندگی کا روشن ترین لحہ ہو گا۔

اسی کے انتظار میں اٹھارہ سال بیتے ہیں اور اسی کی یاد میں ساری زندگی بیت جائے گی۔۔ پھر یہ خوشی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ پھر یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہو گا۔۔۔ اور پھر یہ لحہ روشن نہ ہو گا۔

یہ سب کچھ جو ایک سپنے کی طرح میرے سامنے ہو رہا تھا۔۔۔۔ خواب حقیقت تھا۔۔۔ میں جذباتی ہو رہا تھا مگر ابھی رسم ختم نہیں ہوئی تھی۔

دولھا دلھن دونوں نے سردار کے پاؤں چومے۔ سردار نے شفقت سے ان کے سر پر باری باری ہاتھ رکھا۔ یہ جگنو مالا ریت کی آخری کڑی تھی۔ اب وہ میاں بیوی تھے اور شادی کے مقدس رشتے میں بندھ گئے تھے۔

میں اپنے گھاس کے بستر پر لیٹا تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ جگنو ریت سے لوٹتے سے تن تارارا مجھ سے کہہ گئی تھی کہ ابا سو جائے تو میں آؤں گی۔

گزرے ہوئے خواب کی طرح میں جگنو مالا ریت کے تصور میں گم تھا۔۔۔۔ میرا ذہن مجھے کشاں کشاں پاداما کے ساتھ لے گیا تھا۔

اس وقت وہ اپنے محبوب کی آغوش میں ہو گی اور دونوں کس طرح گھل مل کر باتیں کر رہے ہوں گے۔

برسوں کے پالے ہوئے ارمانوں کی منزل پر پہنچ کر انسان کیا سوچتا ہو گا۔۔۔؟ خوشی ہی خوشی۔۔۔۔ یہ تو ہے۔ مگر پانے کے بعد کیا زندگی کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔۔۔؟ کیا خوشی کو زوال نہیں آتا۔ کیا خوشی بوڑھی نہیں ہوتی؟ مجھے اس کا تجربہ نہیں تھا۔ کاش آنے والے کل کی پاداما مجھے یہ راز بتاتی

کہ منزل پر پہنچ کر آدمی کیا محسوس کرتا ہے اور حصول منزل کے بعد آنے والا دن کیسا ہوتا ہے؟

اس طرح کے ان گنت سوالات میرے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے کہ تن تارارا ہولے سے اندر آ گئی اور آہستہ سے بولی۔

"تم ابھی جاگ رہے ہو۔۔۔۔؟"

"ہاں۔ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا اور پاداما کے متعلق بھی سوچ رہا تھا۔ میں آج کی ریت سے بہت متاثر ہوا ہوں"۔

"میں جانتی ہوں"۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی رقابت تھی۔ "تمہیں اس کا ناچ بہت پسند آیا ہے"۔

میں نے اقرار کیا۔

"ہاں تارو۔ میں نے ایسا سحر آفرین ناچ پہلے نہیں دیکھا"۔

وہ تنک کر بولی۔

"میں اس سے اچھا ناچ سکتی ہوں"۔

میں نے مذاقاً" کہا۔

"ایسا رقص تو کوئی آسمانی حور ہی کر سکتی ہے۔ اگر تم اس سے اچھا ناچ سکتی ہو تو پھر تمہیں آسمانی حور سے بھی اونچا درجہ دینا پڑے گا"۔

"میں مذاق نہیں کر رہی"۔ وہ اور سنجیدہ ہو گئی۔ "میں تمہیں بتا دوں گی کہ ناچ کیا ہوتا ہے"۔

"خوب"۔ میں نے داد دی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اگر ایسا ہے تو سب سے زیادہ خوشی مجھے ہو گی۔ لیکن حیرت ہے کہ تمہیں یا پاداما کو اس طرح کا بے مثال رقص کس نے سکھایا ہے؟"۔

"لو یہ بھی کوئی بات ہوئی"۔ اس نے مجھے اناڑی سمجھنے کے انداز میں کہا۔ "اب تم کہو گے کہ تمہیں آنکھ جھپکانا کس نے سکھایا ہے۔ میں پوچھتی ہوں' بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور دوسرے لمحے ماں کے پستان چوسنے لگتا ہے۔ اب تم پوچھو گے کہ بچے کو یہ بات کس نے سکھائی ہے' تو بے چاری تن تارارا اس کا جواب کہاں سے ڈھونڈھ کر لائے گی؟"

میں ہنس پڑا۔ اس نے ایک معقول بات بڑے سادے اور خوبصورت انداز میں کہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ دبا کر پیار سے پوچھا۔

"تم نے ایسی لاجواب اور پیاری پیاری باتیں کہاں سے سیکھی ہیں؟"۔

"لو تم پھر وہی سوال کر رہے ہو"۔ اب کی اس کے لہجے میں تحیر کے ساتھ پیار اور نرمی تھی۔ "یہ تو روز کی بات ہے۔ تم نے مرغی کے بچے کو دیکھا ہے۔ انڈے سے نکلتے ہی چیں چیں کرنے لگتا ہے اور دانہ ملے تو چگنے لگتا ہے۔ انڈے کے پردے میں اسے کوئی سکھانے تھوڑا ہی جاتا ہے کہ دانہ کھاؤ گے تو زندہ رہو گے۔ بس یہ تو ناگ دیوتا کا کرشمہ ہے کہ وہ ہر چیز میں ایک پوشیدہ طاقت رکھ دیتا ہے جو سمجھائے بغیر کام کرتی رہتی ہے۔ پاداما اسی طاقت کے سہارے ناچی تھی' خود میں بھی اسی قوت کے سہارے ناچوں گی"۔

تن تارارا نے میری حیرت کے سارے پردے چاک کر دیے تھے۔ یہ لڑکی اپنے احساسات بیان کرنے پر کس قدر قادر تھی۔

اب میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ناچ سیکھنے سکھانے سے زیادہ کسی وجدانی شعور کا نام ہے اور یہ شعور تن تارارا کو فطرت نے پوری طرح ودیعت کیا تھا۔

تن تارارا کو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ پاداما کے رقص کا اثر وہ دور کر چکی ہے۔

پیار بھی کتنا عجیب جذبہ ہے یہ حصے بخرے کرنے کا قائل نہیں۔

وہ میری آغوش میں سمائی جا رہی تھی اور میری روح' میرا ذہن' میرا دل طمانیت اور مسرت کی دولت سے مالا مال تھا۔ میں کائنات کا امیر ترین شخص تھا۔ مجھ جیسا سکھ کسی اور کو حاصل نہیں تھا۔



حالات نے ایک دفعہ پھر پلٹا کھایا۔

رات زیادہ دیر تک باتیں کرنے اور جاگنے کی وجہ سے ہم دن چڑھے تک پڑے سوتے رہے۔ تن تارارا کی چیخ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں سہم کر کھڑا ہوگیا۔ دو آتشیں آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔

تن تارارا کے باپ کے ہاتھ میں کٹار چمک رہی تھی۔ وہ غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا اور زور زور سے دانت بھینچ رہا تھا۔

میں گھبرایا ہوا اور متوحش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ غصے کی شدت سے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ اس کی آواز میں شیر کی سی گرج اور تندی تھی۔

''میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا کمینے پردیسی اگر سردار نے تجھے اپنی پناہ میں نہ لیا ہوتا۔ تو پاپ کا بیٹا ہے' تو نے ناگ دیوتا کے غضب کو للکارا ہے۔۔۔ ناگ دیوتا تجھے بھسم کر کے رکھ دے گا۔۔۔ تو نے جگنو ریت سے پہلے میری بیٹی

کا جنم تباہ کر دیا ہے- میں اب سمجھا ہوں کہ میری بیوی کیوں مر گئی تھی---- وہ یہ تماشا دیکھ کر زندہ کیسے رہ سکتی تھی--- پاپی دیس کے بیٹے ہماری زمین پر یہ کھیل کب کسی نے کھیلے ہیں- تو نے میرا گھر اجاڑ دیا- میری زندگی برباد کر دی' تو نے میرے دامن پر گناہ کا پہلا داغ لگا دیا ہے"-

"باپ"- میں بے حد عاجزی سے بولا- "ہم معصوم ہیں ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا"-

"اوہ"- وہ چیخا- "تم معصوم ہو یعنی میں نے جو دیکھا ہے وہ جھوٹ ہے اور جو سنوں گا اسے سچ مان لوں گا---- واہ مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو"-

"باپ---- میں قسم کھانے کو تیار ہوں"-

"تم زمین و آسمان سر پر اٹھا لو تو کون مانے گا' بے وقوف پاپی- صفائی پیش مت کرو اور زبان سے کچھ نہ کہو- میں نے اپنی عمر میں اس سے بڑی ذلت کبھی نہیں دیکھی- اس سے پہلے کہ تیری بوٹی بوٹی ہو جائے یہاں سے چلا جا- اسی گھڑی یہاں سے نکل جا"-

میں نے تن تارارا کی طرف دیکھا- وہ اب تک سر جھکائے کھڑی تھی لیکن باپ کے اس حکم سے چونکی- اس کے چہرے سے خوف و ندامت کا تاثر یک لخت معدوم ہو گیا-

"ابا"- وہ چیخی-

"تم نے میری بات نہیں سنی"- اس نے تن تارارا کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور میری طرف تحکمانہ انداز میں بڑھا- "میں نے تم سے کہا ہے کہ یہاں سے فوراً" چلے جاؤ"-

میں نے رحم طلب نگاہوں سے بوڑھے کی طرف دیکھا مگر اس وقت وہ شدید غصے کے عالم میں تھا- اس نے مجھے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور دروازے کی طرف دھکیل دیا-

"اب یوں رحم بھری نظروں سے کیوں دیکھ رہا ہے کیا یہ رعایت کم ہے کہ میں نے تجھے ابھی تک ذبح نہیں کیا"-

تن تارارا لپک کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی اور التجا آمیز لہجے میں بولی-

"ابا- اس پر نہ سہی مجھ پر رحم کر- یہ چلا گیا تو میں مر جاؤں گی- میں سچ کہتی ہوں- میں مر جاؤں گی"-

"بے وقوف"- بوڑھے نے اسے پکڑ کر ایک طرف کر دیا- "اسے جانے دے- یہ پاپی ہے- اس نے تمہیں بھی بری راہ پر لگا دیا ہے میری بچی"-

"نہیں ابا نہیں"- وہ چیخ کر بولی- "اسے روکو- روکو ابا ورنہ پھر روؤ گے- پچھتاؤ گے ابا--- ابا---- ابا---- اچھا نہ سہی---- اگر تم میری موت ہی چاہتے ہو تو یونہی سہی"- وہ اوندھے منہ گر پڑی-

میں سر جھکائے بوجھل قدم اٹھا رہا تھا- اس کی سسکیوں کی دبی دبی آوازیں آ رہی تھیں- بوڑھا اس کے پاس بیٹھ گیا تھا اور اس کی پیٹھ پر ہولے ہولے ہاتھ پھیر رہا تھا-

ایک بستی-

دوسری بستی-

اور پھر تیسری بستی-

بے منزل مسافر کہاں جائے---؟ سردار سے کیا کہوں گا کہ تن تارارا کے باپ نے مجھے نکال دیا ہے---؟ کیوں نکال دیا ہے---؟ سردار کے اس سوال کا میرے پاس کیا جواب ہو گا؟ وطن' خاندان' عزیز و اقارب--- یہ تو

میں تن تارارا کی محبت کو بھینٹ کر چکا تھا۔

جب تک سانس ہے میں جگنوؤں کا دیس نہیں چھوڑ سکتا۔ جن فضاؤں میں، جن ہواؤں میں تن تارارا کے سانسوں کی خوشبو مہک رہی ہے انہیں نہیں چھوڑ سکتا۔

"اچھا ابا یونہی سہی---- اگر تم میری موت ہی چاہتے ہو تو یوں ہی سہی"۔

تن تارارا کا یہ فقرہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ باپ کو ڈرانے کی یہ خالی خولی دھمکی نہیں تھی۔ بلکہ اس میں وہ گہرائی اور سچائی تھی جسے میرے وجدان نے محسوس کر لیا تھا۔

معاً مجھے پاداما کا خیال آیا۔ وہی اس کی رازدار سہیلی تھی۔ وہی ہمارے کام آ سکتی تھی۔

☆

اور حسب توقع پاداما میرے کام آئی۔

اس نے شوہر کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ بڑا عالی ظرف نوجوان تھا۔ خود محبت کر چکا تھا اس لئے محبت کے درد کو سمجھتا تھا۔

"جہاں پیار ہو وہاں ایسے واقعات جزوی حیثیت رکھتے ہیں"۔ یہ اس کا خیال تھا۔ اس نے مجھے اپنے گھر پر ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔

پاداما حسب معمول ہنستے مسکراتے مجھے تسلیاں دیتی رہی۔

"بڈھوں کا تو یہی کام ہے کہ چھوٹوں کو ڈانٹتے پھریں مگر کبھی دھمکیوں سے بھی پیار کی ڈور کٹی ہے۔ یہ بہت پرانی ریت ہے۔ جوانی میں لوگ خود پیار کرتے ہیں اور بڑھاپے میں نوجوانوں کو ڈانٹتے ہیں---- وہ شاید اسے نصیحت سمجھتے ہوں لیکن دراصل یہ رقابت ہے۔ ان کی بیٹی ان کے بجائے دوسروں سے پیار کرے۔ یہ واقعی جلنے کی بات ہے"۔

اس کے شوہر نے اس کی تائید کی۔

"پردیسی، تم حیران نہ ہو، پاداما ٹھیک کہتی ہے۔ بیٹی کی محبت پر باپ اس لئے بگڑتا ہے کہ وہ رقیب ہوتا ہے۔ وہ زبان سے اس کا اظہار نہیں کر سکتا مگر اس کے خون میں شرارت چپکے چپکے حرکت کرتی رہتی ہے---- اسی طرح مائیں بھی بیٹوں کی محبت پر چڑتی ہیں یا خوش ہوتی ہیں---- چڑنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بیٹی کی جگہ خود ان سے محبت کیوں نہیں کی جا رہی۔ یہ ان کی ذات سے انکار کے مترادف ہے اور خوش ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ یہ فرض کر لیتی ہیں کہ دراصل محبت ان کی بیٹی سے نہیں خود ان سے کی جا رہی ہے کیونکہ بیٹی ان کا خون اور ان کا وجود ہوتا ہے۔ وہ بیٹی کے روپ میں داماد کی عاشق بنی رہتی ہیں۔ دراصل یہ جنسی معاملہ ہی کچھ ایسا ہے کہ انسان جانور کی طرح سوچتا ہے۔ وہ جانور کی طرح یہ سب حرکتیں بھی کرتا اگر ناگ دیوتا نے تھوڑی بہت عقل نہ دی ہوتی۔ درحقیقت عقل نے ہمیں مجبور و پابند کر دیا ہے ورنہ ہماری فطرت تو کچھ اور ہی چاہتی ہے"۔

پاداما نے مجھے صرف حیران ہی کیا تھا مگر اس کا شوہر تو مجھے حیرت کی حدود سے بھی آگے لے گیا۔ یہ باتیں اگر میری سمجھ سے بالا تھیں تو پھر میری سمجھ میں کیوں آ رہی تھیں۔ یہ لوگ مجھ جیسے پڑھے لکھے نہ تھے مگر فطرت کی ترجمانی میں مجھ سے ہزار گنا زیادہ ماہر تھے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں مہذب معاشرے کی قدروں سے خائف ہو کر فطرت سے دور چلا گیا تھا اور یہ گنی چنی پابندیوں کی وجہ سے فطرت کے زیادہ

قریب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میری عقل ان کی ذہانت کے سامنے ماند پڑ گئی تھی۔
ان کا تفکر آزاد اور ان کے جسم میں دوڑنے والے خون کے تابع تھا۔ میرا شعور اتنا پختہ نہیں تھا کہ سچائی کی پرکھ کر سکتا۔ مگر ان کی باتوں سے میرے احساسات روشن ہو جاتے اور میں خود کو ان کے بہت قریب محسوس کرتا۔ شاید میں جانور ہوتا جا رہا تھا یا فطرت کے تقاضے مجھے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔
جو کچھ بھی تھا مجھے اس پر ندامت نہیں تھی۔ میں خوش تھا۔ تن تارارا کی محبت یا کشش' روحانیت یا جنسیت' جو بھی نام رکھ چھوڑیں ایک ایسی حقیقت تھی جسے میں چھونا چاہتا تھا۔ حاصل کرنا چاہتا تھا اور اگر اس کے لئے فنا ہونا مقدر تھا تو میں فنا بھی ہو سکتا تھا۔
پادامَا کے چہرے پر طمانیت کا ایک عجیب سا احساس تھا۔ یہی تسلی اور ٹھہراؤ میں نے اس کے شوہر کی آنکھوں میں دیکھا۔
پادامَا مکی کی روٹی پر شہد رکھ کر لائی۔
"لو کھاؤ۔ میں تن تارارا کے پاس جا رہی ہوں۔ تم دونوں باتیں کرو"۔
شوہر نے کہا۔ "اکیلی نہ آنا"۔
"بڈھا نہ ہوا تو اسے لے آوں گی"۔
پادامَا جاتے ہوئے بولی----- اناسا نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ اناسا اس کے شوہر کا نام تھا۔

اناسا مجھے پادامَا اور اپنی محبت کا قصہ سنا رہا تھا کہ اتنے میں پادامَا آ گئی۔ وہ ہنس رہی تھی اور بہت خوش تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔
"ارے آ بھی تاری کی بچی۔ رک کیوں گئی۔ نخرے کرتی ہے"۔
وہ واپس بھاگی۔ ہم دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اب تن تارارا بھی اس کے ساتھ تھی۔ سر جھکائے ہوئے۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید وہ بہت روئی تھیں۔ پادامَا نے اسے جھنجھوڑا۔
"یہ کیا کر رہی ہو۔ تمہاری ندامت کی وجہ میری سمجھ میں تو نہیں آتی۔ بڈھے نے پردیسی سے کچھ کہا ہے تو اس میں تمہارا کیا قصور اور پھر پردیسی تم سے ناراض ہی کب ہے"۔
اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسی طرح خاموش کھڑی تھی اور ہونٹ کاٹ رہی تھی۔
اناسا نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا---- میرے قریب جانے پر بھی اس نے سر نہ اٹھایا۔ میں نے اس کے الجھے الجھے بالوں میں انگلیاں ڈال دیں اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ اس کی سرخ انگارہ آنکھیں میری آنکھوں سے چار ہوئیں۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے اور دوسرے لمحے وہ تڑپ کر میرے پاؤں سے لپٹ گئی۔
اناسا اور پادامَا نے بڑے پیار سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پادامَا مسکرا رہی تھی مگر شدت جذبات سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ تن تارارا بھی ہچکیاں لے رہی تھی۔
میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تو اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی--- اناسا نے مجھے اشارے سے منع کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے رو لینے دو۔ جب وہ رو رو کر تھک چکی تو پادامَا نے پیار سے اسے اٹھایا۔ اب اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ پادامَا اس کے آنسو پونچھ کر مجھ سے بولی۔
"بھیا' آپ نے اچھا کیا جو یہاں آ گئے۔ ورنہ یہ بے وقوف نہ جانے کیا کر

بیٹھتی۔ یہ بہت شرمندہ ہے کہ اس کے ابا نے آپ کو برا بھلا کہا۔ اس کی ساری ذمہ داری یہ اپنے سر لے رہی ہے"۔

"بے وقوف ہے۔ بھلا اس سے پوچھو یہ بھی کوئی بات ہے۔ ابا ناراض ہوئے تو یہ ان کا حق ہے۔ بڑے ہمیشہ چھوٹوں کو کہا ہی کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے تو کیا ہوا۔ دیس نکالا تو نہیں ملا۔ میں یہیں ہوں۔ یہیں رہوں گا۔۔۔۔ اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں گا"۔

"سنا؟"

پادایا نے اسے چھیڑا۔۔۔۔۔ وہ مسکرائی اور بڑے فخر اور دعوے سے پادایا کو تکنے لگی۔

اتاسا میرے قریب آ گیا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے کہا۔

"تم اداس نہ ہو تارو۔ جو ہونا تھا' ہو گیا۔ پردیسی یہیں رہے گا۔ ہمارے پاس۔ پادایا اس کے آرام کا پورا خیال رکھے گی۔ یہ اب مہمان نہیں ہے۔ ہمارے گھر کا فرد ہے۔ تم جب چاہو یہاں آ کر اس سے مل لیا کرو۔ تم سے تو میرا بہن بھائیوں کا سا رشتہ ہے۔ ناگ دیوتا نے اسی لئے تو مجھے بہن نہیں دی کہ تمہارے روپ میں یہ رشتہ ملنا تھا"۔

میرا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔ پادایا کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ یہی کیفیت تن تارارا کی تھی۔

اتاسا نے ہم تینوں کو اپنی شخصیت کے طلسم میں جکڑ لیا تھا۔ وہ بڑا ہی عالی ظرف نوجوان نکلا۔۔۔ پادایا بہت خوش قسمت تھی۔ اس کا انتخاب نہایت ہی پائے کا تھا۔

"میں اب جاؤں۔۔۔۔؟" تن تارارا ہولے سے بولی جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔

"کیوں؟" پادایا نے اسے ٹوکا۔ "یہ حجاب اب ختم کرو۔ چلو تم لوگ اندر بیٹھو۔ میں بھنا ہوا گوشت لاتی ہوں۔ بڑے مزے کا ہے"۔

جاتے جاتے وہ پھر رک گئی۔

"پردیسی' تم شہد کھاؤ گے نا؟ بے حد لذیذ اور خوشبودار ہے۔ ہماری شادی میں طرح طرح کے تحفے آئے ہیں۔ کچھ دن تو مزے سے گزریں گے"۔

"لے آؤ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے"۔ اتاسا نے اس سے کہا۔

ہم تینوں اندر جا کر بید کی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ تن تارارا اب بھی کچھ محجوب سی تھی۔۔۔ سمٹی سمٹائی سی۔۔۔ یہ اس کے کردار کا بالکل نیا روپ تھا۔ اتاسا نے اسے ٹوکا۔

"مہمانوں کی طرح نہ بیٹھو تارو"۔

میں ہنس پڑا۔ تن تارارا کو بھی ہنسی آ گئی۔ مگر اس ہنسی میں بھی حیا کی دبی دبی جھلک تھی۔ میں نے اتاسا کو آنکھ ماری۔

"آج تو یہ ایسی ہی رہے گی۔۔۔۔ ہاں کل سے اس کا مزاج بدلے گا"۔

اتاسا نے لقمہ دیا۔ "ہاں' تم اس کے مزاج دان جو ٹھہرے"۔

"تن تارارا۔۔۔ کہاں تو میرے پاؤں سے لپٹی ہوئی تھی اور کہاں یہ کہ بلی کی طرح چھلانگ لگا کر ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔ پادایا ڈھیر سی چیزیں اٹھا کر لے آئی تھی۔ وہ سمجھ گئی اور فوراً" باہر کو لپکی مگر تن تارارا اپنی جھولی بھر کے گئی تھی۔ ابا کا گھر بھی اب کچھ ایسا سونا نہیں رہا تھا۔



اناسا جنگلی مرغ کے شکار کا بڑا ماہر تھا۔ وہ اس خوبصورتی سے تیر پھینکتا کہ شاذ و نادر ہی اس کا نشانہ خطا جاتا۔

اس روز بھی ہم شکار ہی سے واپس آ رہے تھے۔ ہم بہت خوش تھے۔ مرغوں کے علاوہ ایک مور بھی شکار ہوا تھا۔ مجھے تو مور کے گوشت سے کچھ خاص لگاؤ نہ تھا مگر وہاں کے لوگ بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مور کے گوشت سے بہت سی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔

مور سانپ کو کھا جاتا ہے اور سانپ کا زہر اس کے گوشت میں حل ہو جاتا ہے۔ اس طرح انسان کے جسم میں بیماری کے جو جراثیم ہوتے ہیں وہ مور کے گوشت کے زہریلے اثرات سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔

مگر ان کے عقیدے میں جو فلسفہ تھا وہ محض جذباتی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ناگ دیوتا اس لئے خود مور کا شکار بنتا ہے کہ اس کی مخلوق مور کا گوشت کھا کر تندرست رہے۔ اور ناگ دیوتا جس پر مہربان ہو مور کا شکار بھی اسی کو ملتا ہے؟

لہذا اناسا بہت خوش تھا۔ میں بھی خوش تھا۔ گھر پہنچے ہی تھے کہ پادااما لپک کر کٹیا سے نکل آئی۔۔۔۔۔ "ہشت"۔

کر کے اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔

ہم ذرا چونکے۔ مگر اس کے چہرے پر گھبراہٹ نہیں' حیرت تھی اور کچھ کچھ تجسس بھی۔

وہ قریب آ کر رازدارانہ لہجے میں بولی۔ "سردار کے بیٹے آئے ہیں۔۔۔۔۔!"

"اچھا"۔

اناسا حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ لیکن جب وہ آگے بڑھنے لگا تو پادااما نے اسے روک دیا۔

"ٹھہرو۔۔۔۔۔ وہ اکیلا نہیں تن تارارا بھی ہے۔ وہ ایک خاص مقصد سے آیا ہے۔ اس نے مجھے منع کیا تھا کہ کوئی اندر نہ آئے"۔

اناسا نے میری طرف دیکھا۔ میرے لئے یہ نیا انکشاف نہیں تھا۔ مگر پھر بھی غصے سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

اناسا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں سمجھ گیا۔ یہ خاموش تسلی تھی۔ پادااما نے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم چپکے سے دوسری کٹیا میں بیٹھ گئے۔ اب ساتھ والی کٹیا سے دونوں کی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"میں تمہیں کئی روز سے تلاش کر رہا ہوں"۔ یہ سردار کے بیٹے کی آواز تھی۔ "تم جانتی ہو میرے لئے یہ کتنا مشکل کام ہے کہ کسی سے تمہارا اتا پتا پوچھوں۔ آخر سردار کا بیٹا ہوں۔ باپ کے وقار کا خیال کچھ اپنی عزت کا پاس۔ اگر لوگوں سے تمہارا نام لے لے کر پوچھتا پھروں تو یقیناً" لوگ شک کریں

گے"۔

"آپ پہلے بھی میرا پیچھا کرتے رہے ہیں اور میں عموماً" آپ کے ساتھ درشتی سے پیش آتی رہی ہوں۔ اس کی مجھے معافی مانگنی چاہئے لیکن سچ پوچھئے تو مجھے اس طرح کا رویہ اختیار کرنے پر کسی حد تک آپ نے مجبور کیا تھا۔۔۔۔۔۔ آج آپ پھر آئے ہیں۔ میرا خیال ہے جو کچھ آپ کو کہنا ہے واضح طور پر کہہ دیجئے تاکہ روز روز کی کل کل ختم ہو"۔

"ہاں۔ میں اسی لئے آیا ہوں اور یہ امید لے کر کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گی"۔

"آپ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں تو مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ اپنا مقام بھول جائیں یہ آپ کو زیب نہیں دیتا اور میں آپ کو اس کا احساس دلاؤں تو یہ مجھے زیب نہیں دیتا"۔

"تارو۔۔۔۔۔ مجھے اس کا احساس ہے"۔ اس کی آواز گھمبیر ہو گئی۔ "مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ مجھے تمہارے پچھلے سلوک کی ایک ایک بات یاد ہے لیکن کیا کروں۔ میں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس لئے کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے"۔

تن تارارا نے بڑی رکھائی سے جواب دیا۔

"اگر آپ صرف یہی کہنے آئے ہیں تو آپ نے خوامخواہ تکلیف کی۔ یہ بات تو میں جانتی تھی"۔

"لیکن صرف جاننے کو میں کافی نہیں سمجھتا تارو۔ میں اس کا صلہ چاہتا ہوں۔ میں تمہیں اپنی دلہن بنانا چاہتا ہوں۔ ہونے والے سردار کی بیگم"۔

"لیکن یہ دل کی بات ہے سردار۔ میں اپنے دل کو دغا کیسے دے سکتی ہوں"۔

"یہ ریاست کے مستقبل کا سوال ہے۔ میری زندگی کا سوال ہے۔ تم دل کو سمجھا سکتی ہو کہ کون کیا مانگ رہا ہے"۔

"میں اس پر غور کر سکتی ہوں۔ وعدہ نہیں کر سکتی"۔

تن تارارا کی یہ بات سن کر پاداما اور اناسا نے بیک وقت میری طرف دیکھا میرا رنگ زرد پڑ گیا۔

سردار کے لڑکے نے کہا۔

"وعدہ نہیں کرو گے تو میں جگنو ریت میں شامل کیسے ہو سکوں گا۔ صدیوں سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ جس لڑکی کی جگنو مالا ریت میں سردار کا بیٹا شامل ہو جاتا ہے۔ مالا اسی کے گلے میں پڑتی ہے۔ مجھے بھی اس کا یقین ہونا چاہئے"۔

"جب یہ روایت بن چکی ہے تو پھر آپ کیوں ڈرتے ہیں"۔ تن تارارا نے کہا۔

"ڈرتا اس لئے ہوں کہ روایت تو بن گئی ہے مگر ناگ دیوتا کے قانون کے مطابق لڑکی اس کے لئے مجبور نہیں ہے۔ وہ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ وہ سردار کے بیٹے کو نظرانداز بھی کر سکتی ہے"۔

تن تارارا ہنس پڑی۔

"یعنی آپ کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہے؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔ مگر میں تسلی ضرور چاہتا ہوں کہ یہ روایت نہ ٹوٹے۔ یہ نہ صرف میری عزت کا سوال ہے بلکہ پورے قبیلے کے وقار کا مسئلہ ہے"۔

"بات صحیح ہے"۔ تن تارارا نے تائید کی۔ "لڑکی کو قبیلے کے وقار کا خیال ضرور کرنا چاہئے۔ لیکن اگر لڑکی دیوانی ہے' بے وقوف ہے تو سردار کا بھی یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اپنی ذاتی خواہش کے لئے قبیلے کے وقار کو خطرے میں نہ ڈالے"۔

"نہیں تن تارارا نہیں"۔

سردار کا بیٹا سٹپٹا گیا۔

"سردار کی خواہش قبیلے کی خواہش ہے۔ سردار خوش ہو گا تو قبیلہ خوش ہو گا۔ ایک لڑکی کو حاصل کرنے کی خواہش اتنی بڑی نہیں ہے کہ اسے محروم رکھا جائے"۔

"بے شک ایک لڑکی کو حاصل کرنا بڑی بات نہیں ہو گی"۔ تن تارارا کے لہجے میں سختی سی آ گئی۔ "لیکن لڑکی کے جذبات کو اپنی راہ پر لانا بہت بڑی بات ہے۔ رسم و روایات اس کے گوشت پوست کو تو ٹٹول سکتے ہیں مگر اس کے احساسات کو پنجرے میں بند نہیں کر سکتے۔ سوچنے کی بات ہے' اپنی خوشی کے لئے دوسروں کے سینے پر پتھر نہیں رکھے جاتے"۔

سردار کا بیٹا لاجواب ہو گیا۔

"تارو------ میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا مگر تم یہ تو سمجھ سکتی ہو کہ یہاں کی ہر لڑکی میرے قدموں میں سر رکھنے کے لئے تیار ہے۔ البتہ تمہاری سرکشی کو میں نے ہمیشہ نظر انداز کیا ہے اور اس سے میں متاثر بھی ہوں اس لئے اگر تم میری کمزوری بن گئی ہو تو تم میری ہو جاؤ تاکہ یہ کمزوری میری طاقت بن سکے۔ میرا خیال ہے پورے قبیلے میں مجھ سے زیادہ پیار کرنے والا اور مجھ سے اچھا شوہر تمہیں نہیں مل سکتا"۔

تن تارارا ہنس پڑی۔

"آپ کا دعویٰ اگر صحیح ہے تو پھر آپ کو میری جگنو مالا ریت میں ضرور شامل ہونا چاہئے"۔

"پہلے تم مجھ سے وعدہ کرو۔ مجھے یقین دلاؤ کہ مالا میرے گلے میں ڈالو گی"۔

"یہ یقین تو آپ کے اپنے دل میں ہونا چاہئے۔ میں تو وعدہ کر کے بھی وعدہ خلافی کر سکتی ہوں۔ لیکن اگر آپ کا دعویٰ اور یقین سچا ہے' تب میں کیا ناگ دیوتا بھی آپ کے سامنے ہار سکتے ہیں"۔

تن تارارا کا انداز کچھ اس طرح کا تھا کہ مخاطب غلط قسم کے اعتماد کا شکار ہو جائے اور اپنے یقین کے بھرم میں اپنی مصنوعی سچائی پر بھروسہ کر بیٹھے۔ بالکل یہی اثر سردار کے بیٹے نے لیا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کے لہجے اور آواز میں بھی اس اعتماد کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

"اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ اب میں زبان سے کچھ نہ کہوں گا۔ اگر میری محبت سچی ہے تو یہ سچائی تمہارے احساسات میں خود بخود گھل مل جائے گی---- مجھے یقین ہے اور مجھے اپنے دل پر پورا بھروسہ ہے کہ یہ ایک دن تمہیں متاثر کرے گا۔ اور وہ دن۔ دور نہیں ناگ دیوتا کی قسم۔ وہ دن دور نہیں"۔

سردار کا بیٹا کھڑا ہو گیا۔ اس کا سینہ فخر سے پھولا ہوا تھا۔ وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ تن تارارا بھی اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ وہ کچھ دیر بڑے پیار اور محبت سے تن تارارا کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد باہر نکل گیا۔ اس کی چال میں تمکنت تھی۔

ہم تینوں بھی باہر آ گئے۔

تن تارارا کٹیا کے اندر سر جھکائے کھڑی تھی۔ پادااما اندر گئی تو وہ چونکی، مسکرائی اور پھر اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔ مجھے اور اتاسا کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے وہ گھبرا سی گئی۔ مجھے یہ گھبراہٹ کھلی۔

یہ یقین ہونے کے باوجود کہ وہ میرے بغیر کسی کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتی، سردار کے بیٹے سے اس کی گفتگو نے میری طبیعت میں بیزارگی کی کیفیت پیدا کر دی تھی اور میرا ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔

اتاسا حسب عادت مسکرا رہا تھا۔ اس نے اس گفتگو سے کوئی تاثر نہیں لیا تھا بلکہ اس نے تن تارارا کو داد دی۔

"بھئی واہ کیا لاجواب لڑکی ہو۔ تم نے اسے کیسے خوبصورت طریقے سے ٹالا ہے۔ میں تو تمہاری ذہانت کا قائل ہو گیا ہوں"۔

پادااما بھی مسکرا رہی تھی۔

مگر تن تارارا کچھ پریشان سی ہو گئی۔ شاید میری ذہنی کشمکش کا رد عمل میرے چہرے سے عیاں تھا۔

پادااما بہت ہوشیار لڑکی تھی۔ فوراً معاملے کی نزاکت سمجھ گئی۔ مجھے پریشان دیکھ کر بولی۔

"کیوں بھیا۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں پادااما میں بالکل ٹھیک ہوں"۔ میں نے بہانہ کیا۔ "سر میں معمولی سا درد ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا"۔

"واہ بھیا۔ سر میں درد ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔ "ٹھہرو میں ابھی تیل لا کر مالش کرتی ہوں"۔

میں نے اسے روکا منع کیا، مگر وہ کٹیا کے اندر جا چکی تھی۔ تن تارارا اسی طرح خاموش کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔

میری دل گرفتگی اور تن تارارا کی بے بسی کی وجہ اتاسا کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان ایک غیر مرئی پیام بر کام کر رہا تھا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے طور پر اپنے آپ کو محسوس کیا تھا۔

پادااما مجھے صحن میں گرے ہوئے پیڑ کے تنے پر بٹھا کر میرے سر میں مالش کر رہی تھی۔۔۔۔ اتاسا بھی میرے پاس بیٹھ گیا تھا۔

تن تارارا اب بھی چپ چاپ کھڑی زمین کو تکے جا رہی تھی۔ اتاسا نے اس سے کہا۔ "آؤ تارو بیٹھ جاؤ"۔

تن تارارا نے مجروح نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔۔۔۔ وہ کچھ نہ بولی۔۔۔۔ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔۔۔۔۔۔ ان نظروں کا مفہوم اپنی جگہ بہت بڑی سچائی تھی۔

اتاسا حیران ہو رہا تھا۔ اب کچھ کچھ اس نے ماحول کے مزاج کی تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔

پادااما کی انگلیاں بڑے سبک انداز میں میرے سر پر چل رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کے لمس میں ایک عجیب سی توانائی تھی۔ میں اسے شدید طور پر محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سچ مچ میرے سر میں درد تھا مگر اب نہیں رہا۔

یہ لحظہ لحظہ ذہنی تبدیلی، بڑی انوکھی سی یوں پلک جھپکتے میں زندگی کروٹ کیوں لیتی ہے؟

تسکین و تسلی کے حقیر ذرے۔۔۔۔ جب یہ منزل نہیں ہے تو دل ایک

آدھ گھڑی ان کی چھاؤں میں کیوں رک جاتا ہے؟

تن تارارا منجمد آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ان آنکھوں کا نور میرے سینے میں اتر گیا ہے اور اس نے ایک ایک تبدیلی کو دیکھ لیا ہے۔۔۔ جبھی یہ آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ یہ ایک نئی تبدیلی تھی۔ ایک نیا احساس تھا۔

پندرہ بیس منٹ میں انسانی ذہن کے عمل و رد عمل کی یہ بو قلمونیاں حیران کن اور نرالی تھیں۔

ابھی چند منٹ پہلے تن تارارا اور سردار کے بیٹے کی گفتگو سے میرا ذہن بوجھل ہو گیا تھا۔

ابھی چند گھڑیاں پہلے پاداما کی انگلیوں کے لمس سے میرے من میں ایک امنگ ابھری تھی اور اب تن تارارا کی منجمد آنکھوں نے میری روح میں ایک لرزہ سا پیدا کر دیا۔

عجیب ہے یہ زندگی۔ یونہی گزرتے چلے جاؤ تو یہ راہ ختم ہو جاتی ہے لیکن اسے محسوس کرو تو قدم بڑھانا مشکل۔

پاداما ایک لمحے کے لئے رک گئی۔ اس نے ہتھیلی میں اور تیل ڈالنا چاہا تو میں نے کہا۔

"بس کرو پاداما اب درد نہیں ہو رہا"۔

اس نے تیل کی کپی اٹھائی اور اتاسا کے سر میں انڈیل دی۔ اتاسا ہنس پڑا۔ تن تارارا کی آنکھیں پھر جھک گئیں جیسے اس کے مجسمے میں جان آ گئی۔ اس نے ہولے سے، دھیمے سے قدم اٹھایا مگر یہ قدم بوجھل نہیں تھا۔۔۔ اتاسا اور پاداما ایک دوسرے میں محو ہو گئے تھے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میری نظریں تن تارارا کے پیروں پر تھیں۔۔۔۔ میرے احساسات سائے کی طرح اس کے ساتھ جا رہے تھے اور اس کے سبک سبک قدم ان پر پڑ رہے تھے۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

جن کو لوٹ کر آنا ہو انہیں مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

رات کو مجھے نیند نہیں آئی۔ تقریباً" آدھی رات کا سماں ہو گا۔ کچھ دیر تک پاس والی کٹیا سے پاداما اور اتاسا کی کھسر پھسر کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ پھر وہ بھی خاموش ہو گئے تھے۔

کچھ تو دن کے واقعات کا اثر تھا اور کچھ نئے بیاہتے جوڑے کی خلوت کے رازوں کے تجسس نے مجھے بے چین کئے رکھا۔ ان کے دبے دبے قہقہے، ہلکی ہلکی سرگوشیاں اور کبھی کبھی ذو معنی چپ نے میرے سکون کو درہم برہم کر دیا تھا۔

جب سے میں پاداما کے ہاں رہنے لگا تھا، تن تارارا سے راتوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ لیکن آج میں بہت بے چین تھا اور اس سے ملنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔

وہ باپ کے ساتھ کٹیا میں سوتی تھی۔ رات کو یہاں آنے کے لئے میں نے اسے کبھی نہ کہا تھا ورنہ وہ ہر خطرہ مول لینے پر تیار ہو جاتی۔ وہاں تک پہنچنا میرے لئے ناممکن تھا۔ لیکن آج میرے سینے میں ایک عجیب سا طوفان برپا تھا۔ دل کو سمجھانا بے کار تھا۔ میں تڑپ رہا تھا اور اس سے ہر قیمت پر ملنا چاہتا تھا۔ میں اٹھا اور احتیاط سے کٹیا کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

یہ رازوں کی امین۔۔۔۔ سیاہ رات تھی۔ جب میں تن تارارا کے گھر کے صحن میں پہنچا تو میری آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں۔ میرا وجدان روشن

ہو چکا تھا اور اس گھر سے وابستہ یادوں کے جگنو دمک رہے تھے۔

یہ حسرت و یاس میں لپٹی ہوئی عجیب سی تسکین تھی۔

اندر تن تارارا سو رہی تھی۔

میں اسے چھونا چاہتا تھا۔

باہر کی بہت سی چیزوں کو میں چھو چکا تھا۔ اس میں بھی ایک مسرت تھی۔ دروازہ کھٹکھٹاؤں گا تو باپ بیٹی میں سے کوئی بھی جاگ سکتا ہے۔ خطرہ اور خواہش شانہ بشانہ کھڑے تھے۔۔۔ نتائج مختلف نکل سکتے تھے۔

دیر تک دروازے کے سامنے شش و پنج کے عالم میں کھڑا رہا کہ رات کی سیاہی نے مجھے تھپکی دی۔ نئی بات تھی۔ تاریکی میری رہنمائی کر رہی تھی۔ میرے دل کو تقویت سی ملی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

بیم و رجا' اعصاب کھچے ہوئے جسم پر لرزہ طاری۔ عجیب عالم تھا۔۔۔ ایسا نشہ۔۔۔ کہ ہر انسان ڈرے بھی مرے بھی۔۔۔ مگر بڑھے بھی۔

میں نے پھر ہلکی سی دستک دی تو ایسا لگا جیسے کواڑ نے میرے ساتھ سرگوشی کی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سانس یوں چل رہی تھی جیسے بہت دور سے آیا ہوں۔

یہ تو مجھے یقین ہو چکا تھا کہ کوئی کواڑ کے پیچھے کھڑا ہے مگر ہرچہ بادا باد کے مصداق۔۔۔ میں نے اپنے آپ کو اپنے جذبات کے حوالے کر دیا تھا۔۔۔ یہ بڑا ہی صحیح فیصلہ تھا۔ یہی ایک دور ہوتا ہے زندگی میں۔۔۔ جب انسان سچ کا پتلا ہوتا ہے اور حماقتوں حماقتوں میں سچائی کو چھو لیتا ہے۔ کواڑ ذرا سا پیچھے ہٹا۔۔۔ میری سانس رک گئی۔ کوئی تھا۔ کوئی ہے۔ کواڑ ذرا اور پیچھے ہٹا۔ ایک ہلکی سی آواز نکلی۔ یوں محسوس ہوا جیسے یہ آواز میرے کلیجے سے پار اتر گئی ہو۔۔۔ میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ چند لمحوں کے لئے ایک جگرپاش سناٹا چھایا رہا۔

میری نظریں کواڑ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ تن تارارا پیچھے کھڑی ہے۔ یہ تسلی کرنے کے لئے کہ اس کا باپ جاگ نہیں رہا۔

آہ یہ لمحے۔۔۔ پل پل گھاؤ لگاتے رہے۔ گھاؤ بھرتے رہے۔ کوئی کیسے بیان کرے۔ کیسی کہانی تھی یہ۔۔۔ کیسا احساس تھا یہ۔ اور کیا کیا جذبے تھے ان میں۔

کوئی شاعر' کوئی نثار اسے کیا بیان کرے گا۔ یہ تو بس محسوس کرنے والی باتیں ہیں۔

ساری کائنات کا شعور ایک طرف۔۔۔ اور محبوب کی گلی کا پھیرا ایک طرف۔ وہی جانے جو اس کوچے سے گزرا ہو۔

میرا خیال صحیح تھا۔۔۔ تن تارارا بڑی احتیاط سے کواڑ کے پیچھے سے نکل کر باہر آئی۔

وہ چپ چاپ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ چند لمحے ہم یونہی خاموش کھڑے رہے۔ باتوں میں اتنے معنی کہاں تھے جو اس خاموشی میں تھے۔ دراصل یہ خاموشی نہیں ہم آغوشی تھی۔۔۔ یہ وجدانی ملاپ تھا۔ ذہنی ربط تھا۔ قلبی تعلق تھا۔۔۔ ہم ایک دوسرے کو محسوس کر رہے تھے۔۔۔ بن چھوئے ایک دوسرے کو جذب کر رہے تھے۔

اندھیرے کا جگر کتنا شفاف ہوتا ہے۔ اس میں انسان اپنی آتما کو بھی دیکھ لیتا ہے۔

"تارو۔۔۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

وہ کچھ نہ بولی۔ اس نے میرے شانے پر سر رکھ دیا۔ میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اس کے گرم گرم ہونٹ میری گردن سے چھو گئے۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ خوف اور ڈر۔۔۔ مسرت اور سپردگی۔۔۔ جذبات اور لگن۔ یہ لرزش اتنے جذبوں کے اجتماع کا رد عمل تھی۔ خود میری بھی کم و بیش یہی کیفیت تھی۔

"آؤ تارو"۔ میں نے سرگوشی کی۔ وہاں چلیں۔ گاؤں سے ذرا ہٹ کر۔ وہاں خدا کے سوا ہمیں کوئی اور نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ وہاں باتیں کریں گے، سردار کے بیٹے کی باتیں پاداما کی باتیں۔ ایک دوسرے پر شک کریں گے۔ گلے شکوے کریں گے۔ شک اور ڈر بڑے اچھے جذبے ہیں۔ پیار چھننے کا اندیشہ نہ ہو تو پیار پھیکا پڑ جاتا ہے"۔

تن تارارا مسکرانے لگی۔ "چلو"۔

کٹیا کا دروازہ اسی طرح نیم وا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی بغل میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ وہ اب بھی کانپ رہی تھی مگر اس کی لرزش میں بتدریج کمی آ رہی تھی۔ ہم دونوں لڑکھڑا رہے تھے۔ جسموں کی حرارت اور شدت جذبات نے ہمیں مدہوش کر رکھا تھا۔

چاروں طرف کالے کالے دیو قامت پہاڑ کھڑے تھے۔۔۔ اندھیرے کی ممتا کی آغوش وا تھی۔ ہم دونوں اب ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکے تھے۔

صبح پو پھٹے میں واپس آیا تو پاداما اور اتاسا کے قہقہوں نے میرا استقبال کیا۔ وہ کٹیا کے دروازے میں بیٹھے بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ میں جھینپ سا گیا۔۔۔ بات بالکل واضح تھی۔ وہ مجھ ہی پر ہنس رہے تھے۔

"واہ بھیا واہ"۔ پاداما نے تالی بجائی۔ "آپ تو واقعی سچے عاشق نکلے"۔

میں مسکرایا۔ انہیں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔

"بھئی خوب"۔ اتاسا نے اٹھ کر مجھے تھپتھپایا۔ ایسی ہمت تو میں نے زندگی میں کبھی نہیں کی کہ آدھی رات کو پاداما کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا ہو"۔

میں نادم سا ہو کر ہنس پڑا۔ "تو تم دونوں کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے"۔

"ارے بھیا ہم جاگ رہے تھے"۔ پاداما بچوں کی طرح خوش تھی۔ جس وقت آپ دبے پاؤں نکل رہے تھے، اس وقت ہم دروازے کی درزوں سے دیکھ رہے تھے۔ ہم سمجھ گئے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں"۔

"حرکت تو واقعی بے وقوفوں کی تھی"۔ میں نے اقرار کیا۔

"نہیں بھیا، ہم تو بہت خوش ہوئے تھے۔ تھوڑے سے ڈرے بھی تھے اس لئے میں نے اتاسا کو تمہارے پیچھے بھیج دیا تھا۔ بڈھا بڑا سور ہے۔ اس کا ڈر تھا نا"۔

"اچھا۔۔۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "تو گویا تم میرے پیچھے پیچھے گئے تھے۔۔۔؟"

"ہاں بھیا، معاملہ بڑا ٹیڑھا تھا نا"۔ اتاسا معذرت خواہ لہجے میں بولا۔ "تم نے خطرہ مول لیا تھا۔ بڈھے کا ڈر تھا۔ لیکن جب تن تارارا باہر آ گئی تو میری کچھ ڈھارس بندھی۔ اس کے بعد میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرا"۔

"تم لوگوں نے اپنے مہمان کی حفاظت ضروری سمجھی"۔ میں گمبھیر ہو گیا۔ "تم لوگ بہت نیک طینت ہو۔ میں شیطان نہ جانے تمہارے معصوم معاشرے میں کہاں سے گھس آیا"۔

"نہ بھیا۔ یہ کیا کہتے ہو"۔ پاداما تڑپ اٹھی۔

اناسا نے مسکرا کر مجھے جھنجھوڑا۔ "تمہاری حرکت ہمیں بری نہیں لگی تم نے بہت جرأت سے کام لیا ہے۔ اپنے محبوب کے لئے تم اتنے آگے جا سکتے ہو، یہ بڑی بہادری اور دل گردے کا کام ہے۔ تم نے ہمیں پیار کی ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ تم پیار کے لئے مرنا جانتے ہو۔ اس لئے بہت پیارے ہو' اب خوش ہو جاؤ کہ یہ صبح اور حسین ہو جائے"۔

میں نے اناسا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں میں خلوص کے جام تھے۔

وہ کتنا پیارا آدمی تھا۔ میں بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ شدت جذبات سے پاداما کے ہونٹ کانپنے لگے۔ فرط مسرت سے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔

پیار میرا اور تن تارارا کا۔

خوشی پاداما کی' فخر اناسا کا۔

یہ اتحاد ذہن اور اتحاد فطرت کا ایک اور روپ تھا۔

زندگی کو موقع ملے تو وہ یوں ذہن کے دریچوں میں مسرت کی کرنیں تلاش کر لیتی ہے۔

پاداما نے آنکھوں میں آئے ہوئے خوشی کے آنسو پونچھے۔

"بس بھیا۔ اب کبھی رات کو تم وہاں نہیں جاؤ گے۔ ہمیں کھٹکا رہے گا۔ ہمیں تمہارا یہ جذبہ ضرور پسند ہے مگر ہم تمہیں جان بوجھ کر خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ لڑکیوں کے باپ بہت جلوٹے ہوتے ہیں۔ اب اناسا اور میں باری باری پہرا دیں گے"۔

"نہ بابا میں نہیں جاؤں گا۔ میرے لئے تم دونوں خطرے میں نہ پڑو۔ میں وعدہ کرتا ہوں ناک سے لکیریں کھینچنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن میرے ذہن پر پہروں کا بوجھ نہ بٹھاؤ"۔

"اچھا بھئی مان لو پاداما' پردیسی بھائی کھرے آدمی ہیں"۔

"مان تو میں لوں گی لیکن ان محبت کرنے والوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ یہ ناگ دیوتا کو تو دھوکا دے دیتے ہیں مگر اپنی محبت کو دھوکا نہیں دے سکتے"۔

"واہ۔۔۔۔؟" اناسا ہنس پڑا۔ "یہ تو ایک نئی بات کی تم نے۔ اس میں بھی تو محبت کی سچائی کا ایک پہلو ہے کہ انسان دیوتا کو دھوکا دے سکے مگر اپنے آپ کو نہیں"۔

"یہی تو وجہ ہے اعتبار نہ کرنے کی۔ یہ محبت بڑی خود غرض ہوتی ہے بس تم پہرے کے لئے تیار رہنا"۔

میں اور اناسا دونوں ہنسنے لگے۔

"تم ہنستے رہو۔ میں تو ہر قیمت پر پہرا دوں گی۔ اس تاری کی بچی کے دن ہی کتنے رہ گئے ہیں جگنو مالا ریت کے۔۔۔۔ ناگ دیوتا نہ کرے کہ اس سے پہلے کوئی حادثہ ہو جائے اور وہ کہیں کی نہ رہے۔ بھیا کو میری بات ماننی پڑے گی"۔

اناسا اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا اضطراب سمجھ لیا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں پاداما۔ اب نہیں جاؤں گا۔ اگر تمہیں پھر بھی یقین نہیں آتا تو بے شک تم پہرا دو۔ مجھے تن تارارا کا مستقبل اپنی تمناؤں سے زیادہ عزیز ہے"۔

وہ مسکرا اٹھی۔ "میں تمہاری زبان پر نہیں' تمہارے لہجے پر بھروسہ کرتی ہوں۔ تم اس وقت بالکل سچ بول رہے ہو"۔

"اچھا بابا۔ اب اس بے چارے کو معاف کر دو"۔ اتاسا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سورج نکلنے والا ہے۔ کچھ پیٹ کے دھندے کا انتظام کرو۔۔۔ ہوگا نا کچھ کھانے کے لئے؟؟"

"سب کچھ ہے۔ تمہیں شہد اور روٹی لا کر دوں گی۔ بھیا کے لئے گوشت بھون کر لاتی ہوں"۔

"ارے وہ مرغ"۔ اتاسا اچھل پڑا۔ "وہ جنگلی مرغ اور مور سبھی کچھ لاؤ۔ ہم بھی گوشت کھائیں گے"۔

"نہیں مور نہیں ملے گا۔ وہ میں نے تن تارارا کے لئے رکھ چھوڑا ہے"۔

"اچھا آدھا سہی"۔ اتاسا نے خوشامد کی۔ پھر میری طرف منہ کر کے کہا۔ "آدھا۔ کیوں بھیا آدھا"۔

"ہاں کیا حرج ہے"۔ میں نے تائید کی۔ "شکاری کو آدھا حصہ تو ملنا ہی چاہئے"۔

"ہوں۔۔۔" پاداما نے ہونٹ بھینچ لئے اور چلی گئی ہم دونوں بھی کٹیا کے اندر بیٹھ گئے۔ اتاسا نے فوراً" سرگوشی کی۔

"پردیسی بھیا۔ میں تو رات سچ مچ ڈر گیا تھا۔ تم جانتے نہیں ہمارے دیس کے کیسے کیسے قانون ہیں۔ اگر تم پکڑے جاتے تو صبح ہوتے ہی تمہیں ناگ دیوتا سے ڈسوا دیا جاتا"۔

"ہاں اتاسا' مجھے قانون کی عزت کرنی چاہئے۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے خوشی حاصل کی ہے۔ مگر دوستوں کے سینوں پر پاؤں رکھ کر اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ذاتی خوشی کتنی بھی بڑی ہو زندگی کے نظام سے بڑی نہیں ہوتی دوستوں سے تو بالکل بڑی نہیں ہوتی۔ میں معافی چاہتا ہوں اتاسا۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں"۔

"نہیں بھائی' نہیں"۔ اتاسا تڑپ اٹھا۔ "تم اتنی شدت سے اعتراف نہ کیا کرو۔ اگر ہم ایسا ڈرتے تو رات ہی کو تمہیں روک لیتے۔ میں تو صرف یہاں کے دستور بتا رہا تھا"۔

"یہ دستور مجھے تمہیں لوگوں کی وجہ سے عزیز ہیں۔ تمہاری اور پاداما کی عزت میری خواہش سے زیادہ قیمتی ہے۔ تم مجھ پر احسان کرتے۔ موقع ملتا تو میں اس کا صلہ دے دیتا مگر تم نے تو مجھے دوست کہا ہے۔ دوست کا رشتہ ہمارے دیس میں بھی بہت مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے تم مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہو"۔

"پردیسی بھائی۔ میں تجھے جان گیا ہوں۔ میں پہلے دن ہی سے تجھے جانتا تھا۔ جبھی تو اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ اگر سینے کے اندر رکھنے کی گنجائش ہوتی تو ایک طرف پاداما کو اور دوسری طرف تجھے رکھتا۔ تو میرا دوست بھی ہے' میرا بھائی بھی"۔

میں اس خلوص کا کیا جواب دیتا۔۔۔۔ سچائی کا جواب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ ایک مکمل رام تھا جس نے میری زندگی بچائی تھی' بغیر کسی لالچ کے' بغیر کسی حیلے کے۔۔۔۔ ایک یہ شخص ہے' بے غرض اور بے لوث' میری ہر طرح کی مدد کی۔ مہمان بنایا' بھائی بنا دیا۔ حقیقت میں زندگی انہی جذبوں سے عبارت ہے۔

میں چپ چاپ غور سے اسے دیکھتا رہا۔ میری آنکھوں میں عقیدت کے آنسو بھر آئے تھے۔

وہ مسکرا پڑا۔ اس نے اپنی مضبوط انگلیوں سے میرے آنسو پونچھے اور پھر بڑے پیار سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

اس وقت ہم دونوں مسکرا رہے تھے۔ سچ کی اگر کوئی شکل اور صورت تھی تو وہ آج میں نے دیکھ لی تھی۔

ناشتہ کر کے ہم فارغ ہی ہوئے تھے کہ تن تارارا دوڑی دوڑی آئی۔ وہ سہمی ہوئی تھی اور ہانپ رہی تھی۔

"کیا بات ہے تاری۔۔۔۔؟" پاداما نے پوچھا۔

"ابا آ رہے ہیں"۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا اسے معلوم ہو گیا ہے کہ تم رات پردیسی سے ملی تھیں؟"

رات کو تو وہ سو رہا تھا مگر صبح تڑکے میں لوٹی تو وہ جاگ رہا تھا۔ پوچھنے لگا کہاں گئی تھیں؟ میں نے صاف صاف بتا دیا۔ پہلے تو اسے یقین نہ آیا۔ پھر تو تو میں میں ہوئی۔ مجھ سے جھوٹ نہیں بولا گیا۔ میں نے بتا دیا کہ پاداما کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے"۔

پاداما نے گھبرا کر اتاسا کی طرف دیکھا۔ مگر اتاسا نے بڑے تحمل سے کہا۔

"آخر اس کا ارادہ کیا ہے۔ وہ ہم سے لڑنے آ رہا ہے یا بات کرنے۔۔۔؟"

"میں کیا جانوں۔ وہ بہت غصے میں تھا۔ تم لوگ پردیسی کو کہیں چھپا دو"۔

"کیوں چھپا دیں؟" اتاسا نے دوٹوک جواب دیا۔۔۔ "تم اگر سچ بول سکتی ہو تو ہم اسے گھر رکھ کر جھوٹ کیوں بولیں گے۔ ہم اس کے یہاں رہنے پر ہرگز شرمندہ نہیں ہیں"۔

"مگر اب کیا کیا جائے؟" تن تارارا نے گھبرا کر کہا۔

"وہ دیکھو' آ رہا ہے"۔

"آنے دو' میں اس سے نبٹ لوں گا"۔

اب مزید بات کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ سب نے اسے دیکھ لیا تھا۔

اس کے ہاتھ میں کٹار تھی اور وہ بہت غضب ناک دکھائی دے رہا تھا۔

اتاسا اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اور پاداما بھی کھڑے ہو گئے۔ تن تارارا کا باپ کچھ فاصلے پر آ کر رک گیا۔ ایک دو لمحے خاموشی سے سب کو گھورتا رہا۔۔۔ پھر اتاسا سے مخاطب ہوا۔

"تو یہ تیرے ہاں ٹھہرا ہوا ہے؟"

"پہلے یہ تمہارے ہاں رہ چکا ہے"۔

"میں نے اسے نکال دیا ہے"۔

"ہمارے دیس نے ابھی اسے نہیں نکالا"۔

"میں دیس کی بات نہیں کر رہا۔ تمہاری بات کر رہا ہوں۔ تم میرے پڑوسی تھے"۔

"پڑوسی سمجھ کر آتے تو ہاتھ میں کٹار لے کر نہ آتے"۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے مہمان کی حفاظت کرو گے؟"

"میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟"

تارا کا باپ چلایا۔ "اور اگر میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟"۔

اتاسا نے بڑے دھیمے مگر پر عزم لہجے میں جواب دیا۔

"میں اپنی بیٹی سے کہتا اگر تمہیں اس دیس میں رہنا ہے تو جگنو مالا ریت کا انتظار کرو۔ لیکن اگر تمہارا لہو تمہاری زیادہ اچھی رہنمائی کر سکتا ہے تو چپکے سے پردیسی کا ہاتھ پکڑ کر اس دیس سے چلی جاؤ' کیونکہ مرد عورت کا رشتہ باپ اور بیٹی کے رشتے سے زیادہ قدرتی ہوتا ہے"۔

بوڑھا چیخ اٹھا۔

"اتاسا! تم پاگل ہو گئے ہو۔ تم نے یہ سبق کہاں سے سیکھا؟"

"پرندوں سے-----!" اناسا نے اسی لب و لہجہ میں جواب دیا۔ "ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت کا سایہ اس وقت تک اولاد کے سر پر رہتا ہے جب تک ان کے بال و پر نہیں اگتے۔ جونہی وہ پر تولنے کے قابل ہوتے ہیں پھر سے اڑ کر اپنا الگ گھونسلا بنا لیتے ہیں"۔

بوڑھا غصے سے کانپ رہا تھا۔ "تم احمق ہو--- تم نے اپنے گرد پاجیوں کی ٹولی جمع کر رکھی ہے"۔

اناسا مسکرایا۔ "اگر تم وعدہ کرو کہ تن تارارا کو کچھ نہیں کہو گے تو میں اسے تمہارے ساتھ بھیجنے کو تیار ہوں۔ لیکن اگر اسی طرح جھاگ اگلتے رہو گے تو میں اسے بھی روک لیتا ہوں"۔

ہم سب دم بخود کھڑے تھے۔ بوڑھا زچ ہوا جا رہا تھا اور بے چینی سے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

"میں تم سے نبٹ لوں گا۔ یاد رکھو میں نے ابھی شکست قبول نہیں کی"۔

اناسا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔ بوڑھا چند لمحے چیں بجبیں کھڑا رہا۔ پھر واپس جانے کے لئے مڑا۔ پاداما نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ میں نے تن تارارا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ سحرزدہ سی کھڑی تھی۔

اناسا ہماری طرف پلٹا۔

"چلو بڈھے کا دماغ تو ٹھکانے آ گیا۔ اب وہ شرارت نہیں کرے گا"۔

میں نے حیرت سے اناسا کی طرف دیکھا۔ "یعنی اب وہ خاموش ہو جائے گا"۔

"بالکل!" وہ دعوے سے بولا۔ "ان باپوں کو تو یہی بات سمجھانے میں دیر لگتی ہے کہ بیٹی گھر کی بے جان چیز نہیں ہوتی کہ چوری ہو جائے تو چور کو پکڑوانے کے لئے آپ سردار سے شکایت کریں---- بیٹی تو انسان ہے۔ اس کے دماغ میں بھیجا ہے اور جسم میں خون۔ وہ بھی کچھ فیصلہ کر سکتی ہے۔ اپنے آپ کوئی آگ میں نہیں کودتا۔ لیکن اگر کوئی کودنا چاہے تو اسے جل جانے دو تا کہ دوسرے عبرت پکڑیں۔ باپ کو خوش کرنے کے بجائے دوسروں کے لئے عبرت بن جانے میں زیادہ مزہ ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو گی نا؟"

اناسا کی منطق عجیب تھی۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہا مگر وہ بہت خوش تھا۔ میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر وہ تن تارارا سے مخاطب ہوا۔

"تارو۔ یہی ہے زندگی یہ اسی طرح جاری و ساری رہتی ہے۔ تمہاری طرح امنگوں سے بھرے ہوئے لوگ اسے نیا خون بخشتے ہیں۔ بیج اپنا سینہ پھاڑ دیتا ہے تب کہیں جا کر پھل ملتا ہے"۔

"تن تارارا نے اسے پر اعتماد نگاہوں سے دیکھا مگر پاداما نے اسے ٹوکا۔

"تم خوش ہو رہے ہو مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ تم تاری کے لئے کوئی وبال کھڑا کر دو"۔

"ارے نہیں، بڈھا ہار گیا ہے۔ تم نے اس کی جھنجلاہٹ میں میری باتوں کی تائید محسوس نہیں کی؟"

تن تارارا باپ کی بے بسی پر اداس بھی تھی اور دوسری طرف اس کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ یہ یاس اور آس کی عجیب سی شکل تھی۔

اناسا نے اس سے کہا۔ "آج تم یہیں رہو۔ شام کو میں پاداما کو بھیج دوں گا، وہ اسے یہ بات پوری طرح سمجھا کر آئے گی کہ تنہائی اس کے لئے مقدر ہو چکی ہے"۔

"نہیں بھیا، رات کو میں نہیں ٹھہروں گی۔ ابا مجھے کچھ نہیں کہیں گے، اس کا مجھے یقین ہے۔ جہاں تک میرے بس میں ہے، میں جان بوجھ کر انہیں دکھ نہیں دوں گی"۔

اتاسا ہنس پڑا۔ "بھئی بڑی شاندار لڑکی ہو۔ دیکھنا آج بڈھا تمہیں سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے گا"۔

تن تارارا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے دل میں باپ کی ہمدردی پیدا ہو رہی تھی۔۔۔۔ ایسی ہمدردی جس کا احساس تو ہو مگر جو کسی کام نہ آ سکے۔



آخر وہ گھڑی آن پہنچی جس کا لمحہ لمحہ انتظار تھا۔

آج تن تارارا کی جگنو مالا ریت تھی۔ چاروں طرف مشعلیں روشن تھیں۔

سردار حسب معمول تخت پر بیٹھا تھا۔

بچے، بوڑھے، شادی شدہ، جوان جوڑے، کنوارے اور کنواریوں کا ایک بے پناہ سیلاب تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ آج کسی بستی کے کسی گھر میں کوئی فرد باقی نہ رہا ہو گا۔

بلاشبہ تن تارارا جیسی حسین لڑکی اس دیس میں دوسری نہیں تھی وہ اسی دھوم دھام اور امتیاز کی مستحق تھی۔ سردار کا بیٹا آج بہت شاندار لباس پہنے ہوئے تھا اور بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ مگر جونہی اس کی نگاہیں مجھ پر پڑیں اس کے تیور بدل گئے۔ میں اس کے اس رد عمل پر زیر لب مسکرایا۔ تن تارارا اپنی سہیلیوں میں گھری ہوئی تھی۔ پاداما اس کے بالوں میں جگنو الجھا رہی تھی۔

اتاسا نے میرا ہاتھ دبا کر سردار کے بیٹے کی طرف متوجہ کیا۔ وہ سردار کے

اوپر جھکا ہوا تھا اور اس کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا--- سردار اس کی بات سن کر مسکرایا---- غالباً" بیٹے نے رسم میں شامل ہونے کی اجازت مانگی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب سردار نے اس بات کا اعلان کیا تو سب لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں--- تن تارارا نے اس اعلان کو بڑی متانت سے سنا۔ اس کے چہرے پر اقرار یا انکار' خوشی یا تضحیک کا کوئی تاثر نہ تھا۔ ہاں اس کے ارد گرد کی کنواریاں اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔ سب کو اس اعلان سے خوشی ہوئی تھی۔

سردار کا بیٹا مسکراتا ہوا کنواروں کی ٹولی میں شامل ہو گیا۔ کنواروں نے بظاہر خوش آمدید کہی لیکن حقیقت یہ تھی کہ سب کے دل بجھ گئے تھے۔

بھلا سردار کے بیٹے کی موجودگی میں تن تارارا کسی اور کے گلے میں مالا ڈالنے کی حماقت کر سکتی تھی۔

البتہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مالا میرے گلے میں پڑے گی۔ اناسا بھی اس صورت حال کو جانتا تھا اس لئے وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں سردار نے رسم شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ حسب معمول تالیاں بجیں۔

تن تارارا--- اف! اس شوخ و شنگ لڑکی کی چال ڈھال میں کس قدر وقار تھا اور چہرے پر کس قدر گمبھیرتا تھی۔

تمام رسومات میں وہ اسی طرح متین رہی۔ سردار کا سلوک بھی بے حد مشفقانہ تھا۔ بلکہ اس میں پدرانہ جذبے کا رنگ آ گیا تھا۔ رسوم سے فراغت ہوئی تو معاً" ساز بج اٹھے۔ تن تارارا پلٹی--- یوں' جیسے بجلی کوند گئی ہو۔

پادالما کے ناچ سے میں اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس سے اچھے ناچ کی امید نہیں رہی تھی۔ لیکن بلا مبالغہ--- میں نے ایک معجزہ دیکھا۔ تن تارارا کے جسم میں کسی اپسرا کی روح سما گئی تھی۔ سازندوں کا یہ حال تھا جیسے عالم مدہوشی میں ان کے ہاتھ اور انگلیاں چل رہی تھیں---- تن تارارا سازوں کا نہیں' ساز اس کا پیچھا کر رہے تھے یا یوں کہیے کہ دونوں کو کسی غیبی قوت نے ایک سی وجدانی کیفیت میں ہم آہنگ کر دیا تھا۔ وجدانی نغمہ--- وجدانی رقص--- دونوں کے امتزاج نے ایک عجیب سا سماں باندھ دیا تھا۔ بچے بوڑھے جوان سبھی اس طلسم میں جکڑے جا چکے تھے۔

تن تارارا نے ٹھیک کہا تھا۔ "میں تم کو بتا دوں گی کہ ناچ کیا ہوتا ہے"۔

واقعی--- میں ایک صدی کیا' کئی صدیاں اور زندہ رہوں تو بھی ایسا رقص دیکھنے کو نصیب نہ ہو۔ الفاظ اس رقص کے محسوسات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ احساس تو بس احساس ہوتا ہے جسے صرف محسوس کر کے سمجھا جا سکتا ہے۔

پادالما کے ناچ سے میری روح میں گدگدی ہوئی تھی لیکن تن تارارا کے رقص سے جو لطافت میری روح میں تحلیل ہو گئی وہ ناقابل بیان ہے۔

تقریباً" پون گھنٹے تک یہ ہوشربا رقص جاری رہا۔ شاید تن تارارا اپنے جسم اور روح کی ساری طاقت صرف کر چکی تھی۔ وہ بے سدھ ہو کر گر پڑی۔

بعض لوگ چونکے۔ بعض اسی طرح سحر میں جکڑے رہے۔ میں تن تارارا کی طرف لپکا تو اناسا نے جھٹ سے بازو پکڑ لیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے سمجھا دیا۔ خود تن تارارا کا باپ دم سادھے کھڑا رہا۔ سب کی نگاہیں سردار کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

سردار بے حد دکھ اور کرب کے ساتھ اٹھا۔ دستور کے مطابق اس وقت سردار کے سوا کوئی بھی جگنو دلہن کو ہاتھ لگانے کا مجاز نہیں تھا۔ اس نے دونوں

ہاتھوں میں اسے اٹھا کر تخت پر لٹا دیا- پھر اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ادھر ادھر ہٹایا اور منہ پر پانی کے چھینٹے دیے-

اتاسا نے میرا ہاتھ دبایا- اس کے ہاتھ میں وہی جانی پہچانی تسلی اور گرم جوشی تھی- پاداما کے ہونٹ لرز رہے تھے- سردار کے بیٹے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا- اس سے اس کے رد عمل میں سچائی کی جھلک خاصی نمایاں تھی-

تن تارارا کے جسم میں خفیف سی حرکت ہوئی اور تھوڑی دیر بعد اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں- کسی کی آنکھ میں خوشی کے مارے آنسو بھر آئے- کسی نے ٹھنڈی آہ بھری- کوئی ہنس رہا تھا' کوئی مسکرا رہا تھا---- مختلف رد عمل تھے- خوشی کے متضاد روپ-

تن تارارا نے سردار کو اس عقیدت سے اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا تو مسکرائی- سردار کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں- اس نے بڑی شفقت اور پیار سے اس کو سہارا دے کر بٹھایا- تن تارارا اب ہوش میں آ چکی تھی- وہ فوراً اٹھی اور اس نے رسم کے مطابق سردار کے پاؤں چومے-

سردار نے مسکراتے ہوئے اسے جگنوؤں کی مالا دے دی-

جگنوؤں کی مالا ہاتھ میں لے کر اس نے چاروں طرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالی- سردار کے بیٹے کی آنکھوں میں امید و بیم کی چمک تھی- میرا دل جانے کیوں ڈوبا جا رہا تھا- پاداما کے مقابلے میں اس کی سنجیدگی پر مجھے رہ رہ کر حیرت ہو رہی تھی- میں نے اس کا یہ پہلو کبھی نہ دیکھا تھا- شاید خائف ہونے کی وجہ بھی یہی تھی-

وہ ایک ایک نوجوان کے سامنے آ کر رکتی' اسے غور سے دیکھتی پھر آگے بڑھ جاتی- اس کے دیکھنے کا یہ انداز اتنا سحر کارانہ ہوتا کہ مقابل مسکرانے یا خوش ہونے کے بجائے سہم جاتا-

سردار کا لڑکا نوجوانوں کی قطار کے عین بیچ میں کھڑا تھا- تن تارارا اب اس کے سامنے آ گئی تھی- وہ چند لمحے اسے بڑے غور سے تکتی رہی---- یہ یاس اور آس کے لمحے تھے---- سب کو یقین تھا کہ تن تارارا آگے نہیں بڑھ سکتی- مالا سردار کے بیٹے ہی کے گلے میں پڑے گی-

اتاسا نے میرا ہاتھ پھر دبایا- میں اس کا مطلب سمجھ گیا- سردار کا بیٹا کانپ رہا تھا اور اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے لرزنے لگے تھے- اس کی یہ حالت دیکھ کر تن تارارا کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکان آ گئی---- یہ مسکان تلوار کی دھار کی طرح نازک تھی جو سردار کے بیٹے کے سینے میں اتر گئی-

تن تارارا اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ چکی تھی---- سب لوگ حیران تھے- کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا وہ حقیقت تھی- خود سردار کا استعجاب دیدنی تھا-

اتاسا بہت خوش تھا- قطار میں کھڑے کنواروں کو بھی خوش ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ حیران ہی نہیں پریشان بھی ہیں- غالباً انہیں یہ احساس تھا کہ اگر مالا ان کے گلے میں ڈال دی گئی تو سردار کے غیظ و غضب کا نشانہ بننا پڑے گا-

تن تارارا سامنے سے گزرتی گئی اور نوجوان کنوارے مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑے رہے---- موت کا خوف تن تارارا کی چاہت پر غالب آ گیا تھا---- ان کی بے بسی کو محسوس کر کے تن تارارا کے تبسم میں ایک نرالی شان آ گئی تھی-

میں اتاسا کے پاس کھڑا تھا- چونکہ میں ناگ دیوتا کا ماننے والا نہیں تھا اس

لئے دستور کے مطابق کنواروں کی قطار میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا لیکن دنیا جسے محبت کہتی ہے اس کا مذہب نہیں ہوتا۔ دل ہوتا ہے۔

تن تارارا پلٹی۔۔۔۔ اس نے پہلے اتاسا کو اور پھر مجھے دیکھا۔ اس کی نشیلی آنکھوں میں ایک عجیب سا کیف و سرور تھا۔ سب لوگ دم بخود ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

اتاسا مجھے رسم سے پہلے بتا چکا تھا کہ تن تارارا نے مالا میرے گلے میں ڈال دی تو بھرپور احتجاج ہو گا۔ لیکن اگر سردار نے عالی ظرفی سے کام لیا تو وہ تن تارارا کو ناگ دیوتا کا باغی قرار دے کر مجھے بخش بھی سکتا ہے۔ میں نے اتاسا کو نہیں بتایا تھا مگر اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر تن تارارا کو حاصل کرنے کے لئے مجھے ناگ دیوتا کا پجاری بھی بننا پڑ جائے تو بھی اس سے دریغ نہیں کروں گا۔

اس وقت بے حد خوفناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مشعلوں کے سایوں کے علاوہ کوئی چیز متحرک نہیں تھی۔۔۔۔

اس پر اسرار سناٹے میں ہزار بدگمانیوں کے باوجود امید کی ایک رمق بھی تھی۔۔۔ سردار سمیت قبیلے کے ہر آدمی کا یہ خیال تھا کہ تن تارارا پردیسی کو چھوڑ کر قبیلے کے نوجوانوں کی طرف پلٹ آئے گی۔ لیکن پیار نے کب کسی فرد اور جماعت کے وقار کی پروا کی ہے۔۔۔ پیار کی خود اپنی ایک آن ہوتی ہے۔

معاً" تن تارارا نے اس سناٹے کا افسوں توڑ دیا۔۔۔ اس نے مالا میرے گلے میں ڈال دی۔

لیکن اس سے پہلے کہ خوشی اور حیرت کا کوئی تاثر میرے چہرے پر آئے۔۔۔ سردار کے چیخنے کی آواز آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار نیزوں اور برچھیوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔

میں رسم کے مطابق اس کا بوسہ بھی نہ لے سکا۔ برچھیوں کے ہالے میں ہم دونوں کشاں کشاں سردار کے سامنے لے جائے گئے۔

سردار چند لمحے ہمیں گھورتا رہا۔ شاید وہ اپنے حواس مجتمع کر رہا تھا۔ پھر اسی جان لیوا سکوت میں اس کی گرجدار آواز گونجی۔

"جانتی ہو' یہ پردیسی ہے اور ناگ دیوتا کا پجاری نہیں ہے۔ تم اس کے گلے میں مالا نہیں ڈال سکتیں"۔

"سردار۔۔۔" تن تارارا تعظیماً جھک گئی اور پھر اسی احترام سے سر اٹھا کر بولی۔ "مگر میں نے تو مالا اس کے گلے میں ڈال دی ہے"۔

"نہیں"۔۔۔۔ سردار چیخا۔ "ہم مالا اتارنے کا حکم دیتے ہیں۔ پردیسی تم مالا اتار کر پھینک دو"۔

میں نے تن تارارا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا نام و نشان تک نہ تھا۔ میں نے آہستہ سے مالا اتار کر تن تارارا کی طرف بڑھا دی۔ لیکن سردار چلا کر بولا۔

"ہم نے تمہیں مالا پھینکنے کا حکم دیا ہے"۔

میرا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ میں نے بد دلی سے مالا پھینک دی۔ مگر اسی لمحے سرکشی اور بغاوت کی چنگاری میرے سینے میں سلگ اٹھی۔ تن تارارا نے زمین پر پڑی ہوئی مالا کی طرف دیکھا اور پھر بڑی طمانیت سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں عزم اور استقلال تھا۔ سردار نے ایک اور مالا اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

"رسم دوبارہ ہو گی۔ تم پردیسی کو چھوڑ کر کسی کے گلے میں بھی مالا ڈال سکتی ہو"۔

تن تارارا نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ مالا سردار کے ہاتھ سے کھینچ لی۔
سختی کا یہ انداز سردار سمیت ہر آدمی نے محسوس کیا۔ اس معاشرے میں ایسی سر کشی کا مظاہرہ غالباً" پہلی بار ہوا تھا۔ میں دوبارہ اتاسا کے پاس آگیا اور تن تارارا مالا لئے کنواروں کی طرف پلٹی۔ لیکن کنواروں کے چہروں پر ذوق و شوق کی کوئی کیفیت نہیں تھی۔ ماحول کا شاید تقاضا بھی یہی تھا۔

تن تارارا نے خالی خولی نظروں سے نوجوان کی طرف دیکھا پھر وہ ایک ایک کر کے ان کے سامنے سے گزرنے لگی۔ لحظہ بہ لحظہ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ رہی تھی۔

قطار کے آخری نوجوان کے پاس پہنچ کر وہ رک گئی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا--- سب اسے مضطربانہ دیکھ رہے تھے۔ وہ مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں ایک فاتح کی شان اور غرور تھا۔ سردار کے بیٹے کو نظرانداز کرنے کی اہمیت اب اتنی نہ رہی تھی جتنی اس بات کی کہ مالا دوبارہ پردیسی کے گلے میں نہ پڑ جائے۔ تن تارارا نے اسی طرح مسکراتے ہوئے سردار کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

یہ قیامت کی گھڑی تھی۔ زندگی میں پہلی بار سردار کی تمکنت کو یوں کسی نے للکارا تھا--- غیرارادی طور پر اس کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔ تن تارارا اس کی شکست سے محظوظ ہوتے ہوئے مڑی اور صدیوں کے یقین کی روشنی لئے میری طرف بڑھی۔

اس نے دوبارہ مالا میرے گلے میں ڈال دی۔

سردار کانپتا ہوا تخت سے نیچے اتر آیا--- سارا مجمع چیخ اٹھا۔ برچھیوں اور نیزوں نے ہمیں دوبارہ گھیرے میں لے لیا تھا۔ تارارا مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

سردار آگے بڑھا۔ اس نے تن تارارا کو کھینچ کر ایک طرف دھکیل دیا اور مالا میرے گلے سے کھینچ کر تن تارارا کے منہ پر دے ماری۔

"اس بدبخت لڑکی نے نہ صرف ہمارے دستور کا مذاق اڑایا ہے بلکہ ناگ دیوتا کی توہین بھی کی ہے۔ اس کی سزا موت ہی ہو سکتی ہے"۔

"بے شک اس کی سزا موت ہونی چاہئے"۔ اتاسا نے آگے بڑھ کر کہا۔ " لیکن اگر سردار چاہیں تو پردیسی کو موقع دے سکتے ہیں۔ پردیسی ناگ دیوتا کا پجاری بن جائے تو یہ لڑکی اس کے حوالے کی جا سکتی ہے"۔

تن تارارا کا باپ جو اب تک ایک طرف سہا کھڑا تھا' اتاسا کی اس تجویز سے خوش ہو گیا۔ اس نے التجا آمیز نگاہوں سے سردار کی طرف دیکھا۔

"سردار میری ایک ہی بیٹی ہے۔ مجھ پر رحم کیجئے"۔

سردار نے پہلے اتاسا اور پھر تن تارارا کے باپ کی طرف دیکھا۔

"اس لڑکی نے ہماری روایات کی توہین کی ہے۔ اس کے ساتھ نرمی برتی گئی تو قانون کا احترام ختم ہو جائے گا۔ میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ اس لڑکی کی وجہ سے سارے قبیلے پر ناگ دیوتا کا عذاب نازل ہو گا"۔

اتاسا نے پھر ہمت کی۔ "سردار نے میری گزارش پر غور نہیں کیا۔ میرا خیال ہے پردیسی کو ناگ دیوتا کا پجاری بننے میں کوئی عار نہیں ہے"۔

سردار غصے سے اتاسا کی طرف مڑا۔

"تم پردیسی کی حمایت کر کے اپنے لئے کانٹے بو رہے ہو۔ ہم نے پردیسی کو اس لئے پناہ نہیں دی تھی کہ ہماری لڑکیوں کو ورغلائے۔ ہم اپنی روایات نہیں بدل سکتے اور نہ اپنی نسل میں کسی اجنبی کا خون شامل کر سکتے ہیں"۔

"سردار ہمارا خون آسمان سے نہیں اترا تھا۔ وہ بھی اسی مٹی کے رس سے

بنا ہے جس سے اجنبی کا"۔

اناسا کے اس جواب سے سارا قبیلہ حیران رہ گیا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہاری زندگی کا آخری دن آ پہنچا ہے اناسا"۔

اناسا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اگر سچی بات کہنے سے زندگی ساتھ چھوڑنا چاہے تو میں اس سے رکنے کی التجا نہیں کروں گا۔ لیکن یاد رکھیۓ۔ صدیوں کے بعد آج ایک زبان کھلی ہے۔ سچ کی دوسری زبان کھلنے میں صدیاں نہیں لگیں گی"۔

"مجھے اس لڑکی سے پہلے اس بے وقوف اناسا سے نبٹنا پڑے گا"۔

سردار نے آپے سے باہر ہو کر کہا۔ "تم لوگ اپنی کمانیں کھینچ لو اور اگر یہ بے وقوف دوبارہ زبان کھولے تو اس کا سینہ چھلنی کر دو"۔

پاداما لپک کر اناسا سے لپٹ گئی۔

"رحم سردار رحم۔۔۔۔۔ ناگ دیوتا کے لئے یہ ظلم نہ ڈھایئے"۔

اناسا کی آنکھوں میں چمک تھی۔ وہ ذرا بھی مرعوب نہ ہوا تھا۔ موت کی ان گھڑیوں میں دوسرا فرد تن تارارا تھی۔ جس کے چہرے پر خوف و خطر کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اناسا کے منہ پر پاداما نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ تیر اندازوں نے کمانیں کھینچ لی تھیں۔

اناسا بظاہر خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں احتجاج اور بغاوت کی آگ روشن تھی۔ لیکن اس کی خاموشی کو اس کی ہار ظاہر کرنے کے لئے سردار نے اپنے طور پر ہوشیاری کا ثبوت دیا۔

"ناگ دیوتا کی قسم۔ اس کی سرکشی کی سزا موت تھی لیکن اس کی بیوی کی التجا سے ہمارا ارادہ بدل گیا ہے"۔

پھر وہ لوگوں سے مخاطب ہوا۔ "یہ رسم ملتوی کی جاتی ہے۔ تن تارارا کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ موت اور زندگی میں سے کوئی سی راہ انتخاب کرے۔ سارے قبیلے کا فرض ہے کہ اس لڑکی کو فردا" فردا" سمجھائے کہ زندگی موت سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ یہ رسم کل پھر ہو گی"۔

سردار چلا گیا تو لوگ اناسا اور تن تارارا کے گرد جمع ہو گئے۔ تن تارارا کا بوڑھا باپ آنکھوں میں التجاؤں کے قافلے لئے بیٹی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

تن تارارا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ دونوں کے ہونٹ لرزنے لگے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پھر دونوں بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔



سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میں اور اتاسا گھر میں اداس بیٹھے تھے۔ اتاسا سردار کے خلاف بھرا بیٹھا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ تعصب نے سردار کو اندھا کر دیا ہے۔ وہ بھٹک گیا ہے مگر اس کا مقصد پھر بھی حاصل نہ ہو گا۔ میں نے تن تارارا کی آنکھوں میں جو عزم و استقلال دیکھا ہے اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ نکلے گا"۔

"نتیجہ یہی نکلے گا نا کہ وہ موت سے ہم کنار ہو گی۔ مگر اتاسا میں یہ نہیں چاہتا کہ ایسا ہو۔ تم بھی اسے سمجھاؤ اور میری طرف سے بھی کہہ دینا کہ وہ مالا سردار کے بیٹے کے گلے میں نہیں ڈالنا چاہتی تو نہ ڈالے، کسی اور کا انتخاب کر لے"۔

"نہیں پردیسی"۔ اتاسا نے مجھے سختی سے ٹوکا۔ "وہ مرنا چاہتی ہے تو اسے مرنے دو۔ یہ اپنی مرضی سے جینے کی خاطر پہلی موت ہو گی۔ سردار کے غرور کے خلاف پہلی بار تن تارارا کے لہو کا قطرہ اس مٹی کا بوسہ لے گا۔ یہ موت نہیں

آزادی کا پہلا نعرہ ہے۔ اسے مرنے دو"۔

اتاسا نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ میں نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اتاسا، تمہاری جو مرضی ہو کرو مگر ایک بار مجھے اس سے ملوا دو۔

اتاسا نے میرا ہاتھ دبایا۔ "ابھی چلو۔ آج اس کا باپ تمہارا راستہ نہیں روک سکتا بلکہ آج تو تم اسے بہت پیارے لگو گے۔ آج وہ دن ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو موت کی راہ دکھانے والے سے بھی نفرت نہیں کر سکتا"۔

اتاسا نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ جوانوں کی طرح بوڑھوں کی نفسیات کو بھی خوب سمجھتا تھا۔

میں بہت دنوں کے بعد تن تارارا کے گھر گیا تھا--- بوڑھا مایوس اور نڈھال ایک طرف سر جھکائے بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے سر اوپر اٹھایا۔ چند گھنٹوں نے اس کی زندگی کا سارا رس نچوڑ لیا تھا۔

وہ گھٹنوں پر ہاتھوں کا سہارا لے کر اٹھا۔ اس کی عقابی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور کندھے جھک گئے تھے۔ وہ ہمیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے ہم جنت کے فرشتے ہوں اور اس کی بیٹی کی موت کا حکم نامہ واپس لینے آئے ہوں۔ مجھے محسوس ہوا کہ موت کی وہ خبر کس قدر بھیانک ہوتی ہے جس کا انکشاف چند گھنٹے پہلے ہو جاتا ہے۔

میں مجرموں کی طرح سر جھکا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں مظلومیت کا احساس نمایاں تھا۔ زندگی اسے شکست دے چکی تھی۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم نے ایک دوسرے کو اپنے دکھوں کی کہانی سنا دی تھی۔ اس میں بھی ایک منفی سی تسکین تھی۔ دشمن بھی پلک جھپکتے میں

دوست بن جاتے ہیں اگر ان کے مفاد مشترک ہوں۔

زندگی پل پل میں اپنی راہ بدلتی اور متعین کرتی ہے۔ یہ حالات کے تقاضے ہوتے ہیں جو دشمن اور دوست پیدا کر دیتے ہیں۔ اور یہی تقاضے ہوتے ہیں جو اجتماعی زندگی میں جنگ اور امن کی بنیادیں رکھتے ہیں۔

بوڑھے کے ہاتھ کی گرمی برابر میں اپنے جسم میں جذب ہوتے محسوس کر رہا تھا کہ اتاسا کا بھاری بھرکم ہاتھ میرے کندھے پر پڑا۔

"آؤ۔ تن تارارا سے بھی مل لو"۔

بوڑھے نے میرے کندھے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

تن تارارا سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ سہیلیاں اسے سمجھا رہی تھیں مگر وہ دور خلا میں ٹکٹکی باندھے کسی غیر مرئی چیز کو دیکھ رہی تھی۔

وہ بڑے تحمل اور صبر سے سب کی سنتی رہی۔ اس کے رویے میں ضد یا اصرار کا کوئی عنصر نہیں تھا۔ اس نے کسی کی دل شکنی کی' نہ کسی کی بات سننے سے انکار کیا۔ بس چپ چاپ بیٹھی رہی۔

پاداما نے اسے جھنجھوڑا تو اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اور اس کے لبوں پر ملکوتی مسکراہٹ پھیل گئی۔

مجھے عجیب سا لگا۔ میں اس لڑکی کو خاک سمجھاؤں گا جس کے ایک ہی تبسم نے میری روح میں نشۂ انڈیل دیا تھا۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ خودکشی حرام ہے--- یہ میرے معاشرے کی باتیں ہیں۔ میرے دیس کی قدریں ہیں جو خودکشی کو بزدلی سمجھتا ہے--- زندگی سے فرار کہتا ہے۔

میں نے تو زندگی میں ایسی استقامت پہلی بار دیکھی تھی----- یہ روح کو لرزا دینے والا یقین' یہ موت سے ہم کنار ہونے کی خواہش۔ یہ زندگی کی ان گنت رعنائیوں سے سنگین بے نیازی۔ اسے بزدلی کون کہے۔ اسے خودکشی کون سمجھے۔

یہ ہیجانی کیفیت کی بات نہیں تھی۔ یہ جذباتی فیصلہ بھی نہیں تھا۔ بقول اتاسا--- "یہ اپنی مرضی سے جینے کی خاطر پہلی موت ہو گی"۔

تن تارارا بدستور مسکرا رہی تھی۔ پاداما سمیت دس بارہ لڑکیاں اور اس کے اردگرد بیٹھی تھیں۔ سبھی میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ لیکن تن تارارا کی طرح ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں' حسرت و یاس تھی۔

یہ منظر دیدنی تھا۔

یہ لڑکیاں اس آدمی کو دیکھ رہی تھیں جس نے تن تارارا سے پیار کیا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تن تارارا نے اس سے پیار کیا تھا۔ اور پیار بھی ایسا جس نے صدیوں کی روایات کو بدل ڈالا تھا۔ جس نے سردار کے غرور کو للکارا تھا اور جس نے بغاوت کا پہلا بیج بویا تھا۔ یہ پہلی نگاہ تھی جو سردار کی نگاہ سے ٹکرائی تھی--- یہ پہلی آواز تھی جس کی گونج سارے قبیلے نے سن لی تھی۔

اور یہ سب کچھ اس آدمی کی خاطر ہوا تھا جو اس وقت ان کے سامنے کھڑا تھا۔ بے شک مجھے اس پر فخر کرنے کا حق تھا اور بلا شبہ اس وقت میرا سینہ خوشی سے پھول گیا تھا۔ میں اتاسا کے گھر سے کیا جذبہ لے کر آیا تھا اور اب میرا سینہ کسی اور احساس سے بھر گیا تھا---- یہ انسانی ذہن بھی کیسا تماشا ہے۔ یہ غم اور موت کے موقع پر بھی اپنی اہمیت اور شخصی وجاہت بڑھانے کی فکر سے آزاد نہیں ہوتا۔

اناسا ہماری خاموشی سے محظوظ ہو کر بولا۔ "پردیسی تم تو کوئی بات کرنے آئے تھے"۔

"نہیں اناسا۔ میں نے تلقین کا خیال ترک کر دیا ہے۔ سچائی کو سچ سے روکنے کا کام میرے ذمے نہ ڈالو۔ مجھے تن تارارا کا فیصلہ منظور ہے' سچ باقی رہنا چاہئے۔ موت اتنی خوفناک چیز نہیں ہوتی"۔

اناسا نے مسکرا کر میرا ہاتھ دبایا۔ ہم دونوں واپس چلے آئے۔

رات گزر گئی۔ صبح ہو گئی۔

پادا ما رات تن تارارا کے پاس ہی رہی۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ اناسا نے ایک گوشے سے خشک گوشت کے چند ٹکڑے نکالے اور بولا۔

"آؤ پردیسی' آج ناشتا اسی سے ہو گا۔ پاداما تو آج بھی سارا دن نہیں آئے گی۔ وہ بہت جذباتی لڑکی ہے۔ ان حالات میں وہ تن تارارا کا ساتھ نہیں چھوڑے گی"۔

میں نے اناسا سے پوچھا۔ "سردار نے سوچنے کے لئے جو دن رات کی مہلت دی ہے' وہ کیا نیک نیتی پر مبنی ہے؟"

"ہاں پردیسی' اس میں اس کی نیک نیتی صرف اس قدر ہے کہ کوئی سمجھا بجھا کر تن تارارا کو اس بات پر آمادہ کر دے کہ وہ مالا اس کے لڑکے کے گلے میں ڈال دے۔ یہ اس کے وقار کا سوال ہے"۔

"مگر اناسا۔ تمہارے معاشرے میں سردار کا رتبہ بہت اونچا ہے۔ لوگ روحانی طور پر اس کے تابع ہیں"۔

"نہیں پردیسی---- ناگ دیوتا بھی اگر انصاف کرنا چھوڑ دیں گے تو لوگ اس سے بھی باغی ہو جائیں گے۔ دنیا صرف انصاف کے گرد جمع ہوتی ہے۔ بے انصافی اور ظلم کو لوگ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے"۔

اناسا کے باغیانہ خیالات سن کر مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ میں نے گزشتہ رات کچھ اور لوگوں کی آنکھوں میں بھی اناسا کی آنکھوں کی چمک دیکھی تھی---- زبان ایک کھلی تھی' آنکھیں ان گنت کھلی تھیں۔

اناسا مجھے دیکھ کر بولا۔ "تم دیکھو گے پردیسی۔ اگر تن تارارا مر گئی تو اس کی موت ایک نئی سوچ کو جنم دے گی۔ یہ سوچ سردار کے تابوت میں بدبختی کی پہلی اور آخری کیل گاڑ دے گی"۔

میں اناسا کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ مجھے اس روز بھی اچھا لگا تھا جس دن پاداما نے اس کے گلے میں جگنوؤں کی مالا ڈالی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کا سحر برابر کام کرتا رہا۔ لیکن اب تو اس کی شخصیت سے میں پوری طرح مرعوب ہو چکا تھا---- وہ بلا کا ذہین' نڈر اور جرائت مند نوجوان تھا۔

سوکھے گوشت کے ٹکڑے چباتا ہوا اناسا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"پردیسی! تم رات بھی نہیں سوئے۔ میں تمہارے دل کی حالت جانتا ہوں' کوشش کرو کہ آنکھ لگ جائے۔ مجھے ایک دو بستیوں میں جانا ہے۔ کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔ شام ہونے سے پہلے لوٹ آؤں گا۔ جگنو مالا ریت پر اکٹھے چلیں گے"۔

اناسا سمجھا تھا کہ میں اس سے بے خبر ہوں' حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ بھی رات بھر نہیں سویا۔ مجھے کٹیا میں لٹا کر خود چپکے سے کھسک گیا اور صبح پو پھٹنے سے پہلے دبے پاؤں واپس آ کر لیٹ گیا تھا۔ مگر میں نے اسے بتایا نہیں۔ ویسے میرا پختہ یقین تھا کہ وہ کسی مقصد سے باہر رہا ہے اور اب بھی اسی مقصد سے باہر جا

رہا ہے۔

میں مسکرایا تو وہ ہنس پڑا۔ میری مسکراہٹ اگر پر معنی تھی تو اس کی ہنسی اس سے زیادہ پر معنی تھی۔ وہ ہنستا ہو چلا گیا اور میں سوچتا رہ گیا------ اناسا ضرور کوئی کھیل کھیلے گا۔

میں بہت دیر تک گھاس پر لیٹا رہا۔ مگر نیند نہ آئی۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن ماضی کی طرف پلٹ گیا۔ میرے بہن بھائی' میری ماں' میرا باپ' میرا وطن اور میرے دوست------ بلونت سنگھ' مہردین اور کمل رام۔ کوئی پھول کھلتا ہے' عمر طبعی پاتا ہے۔ پھر اس کی پتیاں جھڑ کر خاک میں مل جاتی ہیں۔ کوئی پھول کھلتے ہی توڑ لیا جاتا ہے اور کوئی کلی کھلنے سے پہلے ہی مٹی میں مل جاتی ہے۔

بلونت مرگیا۔ مہردین مرگیا۔ کمل رام بھی مرچکا ہو گا۔ بلونت بیماری سے مرگیا۔ مہردین گولی سے مرگیا۔ کمل رام اس لئے مرا ہو گا کہ اس نے مجھے زندگی بخشی تھی۔ میں اگر کسی حادثے کا شکار نہ ہوا تو کسی دن طبعی موت مر جاؤں گا---- فنا تو بہرکیف مقدر ہے۔

جب مرنا اٹل ہے تو انسان کمل رام کی طرح کیوں نہ مرے۔ تن تارارا کی طرح موت کو کیوں نہ للکارے؟

جب موت اتنی خوبصورت چیز ہے تو اس کا ذائقہ چکھنے میں کیا حرج ہے۔ یہ موت تو ایک نئی فکر کو جلا بخشتی ہے۔ پھر دیے سے دیا جلانے میں کیا برائی ہے؟

موت کے متعلق یہی سنا اور دیکھا تھا کہ وہ زندگی کو حسرتوں سے دو چار کر دیتی ہے۔ مگر یہ ایک نیا تاثر تھا کہ وہ جینے کی ایک نئی راہ بھی سجھا دیتی ہے۔ زندگی جمود کا نام نہیں ہے۔ روایت کی ایک عمر ہوتی ہے۔ وہ ایک نسل کے بعد

بوڑھی ہو جاتی ہے---- راہ حیات میں انسان روز نت نئے تجربوں سے دو چار ہوتا ہے---- کل جو بات درست تھی' آج اس پر شک کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔ حالات کا تقاضا ہو تو کسی کے ہاتھ سے نوالہ چھیننے کو بھی سچائی کہا جا سکتا ہے۔

اناسا مجھے اس لئے پسند تھا کہ وہ سچائی کو وجدانی طور پر محسوس کرتا تھا---- جس طرح باز کو منڈلاتا دیکھ کر مرغی کو اپنے بچوں کو بچانے کا الہام ہو جاتا ہے۔ بعینہ اناسا کی سچائی پلک جھپکتے میں جنم لیتی تھی۔ اس کی یہ فطری ادا ہر قدم پر میری رہبری کرتی------ میرے شعور کو نکھارتی اور ذہن کو راستہ دکھاتی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے روایتوں کو خیرباد کہہ دیا تھا اور نئی سچائیوں کا ساتھ دے رہا تھا۔

اندھیرا ہونے سے پہلے اناسا لوٹ آیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ وہ دیر تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتا رہا---- اس نے میری پیشانی چوم لی۔ پھر اس نے میرے شانوں کو پکڑ کر جھنجھوڑا۔ پھر وہ ہنس پڑا اور بڑے عزم و استقلال سے کہا۔

"چلو پردیسی"۔

* * *

مشعلیں روشن ہو چکی تھیں۔

سردار تخت پر بیٹھا ہُوا تھا---- آج بھی کل کی طرح بستیوں میں شاید کوئی فرد باقی نہ رہا تھا۔ کنواروں کی لمبی قطار بھی کل کی طرح کھڑی تھی۔ مگر آج یہ بالکل محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب لوگ جگنو مالا ریت کی رسم میں آئے ہوئے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی جنازہ اٹھنے والا ہو۔

سردار بھی سنجیدہ تھا اور اس کا لڑکا کنواروں کی قطار میں چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔ مَیں اور اتاسا بھی کل والی جگہ پر کھڑے تھے۔

تن تارارا کنواریوں کی جھرمٹ میں تھی۔ دو لڑکیاں اس کے بالوں میں جگنو اٹکا رہی تھیں---- پورے مجمع میں تن تارارا واحد لڑکی تھی جس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی جگنو مالا ریت کو پورے جوش و خروش سے منا رہی ہے اور آج اس کی آرزوؤں کو واقعی پروان چڑھنا ہے لیکن اس کے بوڑھے باپ کی آنکھوں میں ایسی کوئی خوشی نہیں

تھی---- وہ چپ چاپ مایوس اور بے بسی کے عالم میں کھڑا تھا۔

سردار نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ایک لمحے کے لئے اس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ملیں مگر ان میں خلوص اور رواداری نہیں تھی۔ مجھ سے زیادہ اس بات کو اتاسا نے محسوس کیا اور اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اس کا رویہ قطعی باغیانہ تھا۔

سردار نے رسم شروع کرنے کا اشارہ کیا۔

تن تارارا بڑے وقار سے کنواریوں کے ہجوم سے نکلی---- اس کی آنکھوں میں عزم' چال میں ٹھہراؤ اور ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جلتے بجھتے جگنو اس کے بالوں میں جگمگا رہے تھے۔ یہ غالباً" وہاں کی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ کسی کنواری کی جگنو مالا ریت دوسری بار ادا کی جا رہی ہو۔

سردار کے قریب پہنچ کر وہ تعظیماً" جھک گئی۔ اس کے اس انداز میں سردار کے احترام کا واضح احساس موجود تھا۔ سردار نے خلاف معمول بغیر مسکرائے جگنوؤں کی مالا اسے تھما دی۔

تن تارارا مالا لے کر مڑی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ لوگوں کے زرد چہرے اور اداس آنکھیں دیکھ کر بھی وہ اداس نہ ہوئی۔ کنواروں کی قطار کا دوسرا سرا جہاں ختم ہوتا تھا اس سے پانچ قدم آگے میں اور اتاسا کھڑے تھے۔

تن تارارا کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے وہیں آ کر رکیں۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا اور میرے رونگٹے یکبارگی کھڑے ہو گئے۔ سردار پورے رعب اور دبدبے کے ساتھ بظاہر بے تعلقی کے انداز میں بیٹھا تھا مگر اس کی بے چینی اور ذہنی کشمکش کا پتا اس کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔

تن تارارا ایک ایک کر کے کنواروں کے سامنے سے گزر رہی تھی حتیٰ کہ

وہ لمحہ آگیا۔ امتحان کا' آزمائش کا' سردار کا بیٹا سر جھکائے کھڑا تھا اور تن تارارا نخوت سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

اناسا زیر لب مسکرا رہا تھا---- اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ تن تارارا کا یہ رویہ سردار اور اس کے بیٹے سے انتقام کے سوا کچھ نہیں۔

لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب تن تارارا بڑی ادا اور شان سے سردار کے بیٹے کو نظرانداز کر کے آگے بڑھی۔ سردار تڑپ اٹھا مگر اس کے رتبے اور وقار کا تقاضا تھا کہ چپ رہے۔ اس نے اپنی بائیں جانب کھڑے ہوئے تیراندازوں کی طرف نگاہ اٹھانے پر ہی اکتفا کیا۔ تن تارارا کنواروں کی قطار کے آخری سرے پر پہنچ چکی تھی۔

لوگوں پر خوف و دہشت طاری تھا۔ تن تارارا کا باپ تھر تھر کانپ رہا تھا اور اس کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی تھی۔

تن تارارا نے کل کی طرح آج بھی مڑ کر کنواروں کی لمبی قطار کا جائزہ لیا---- خود سر اور خود مختار ملکہ کی طرح اس کی گردن تنی ہوئی تھی۔ وہ سچ مچ ان ساعتوں کی حکمران تھی۔

جب تک وہ قانون توڑ کر مالا میرے گلے میں نہ ڈالتی اسے اختیار تھا کہ آزمائش کی ان گھڑیوں کو طوالت دیتی رہے اور من مانی کرتی رہے۔ سعادت کی اس گھڑی کی عمر مختصر سہی مگر بلا شبہ یہی ساعت اس کی زندگی کی سب سے بڑی سعادت تھی۔

وہ اچانک ہنس پڑی۔

پھر اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔

یہ ایسا قاہرانہ قہقہہ تھا کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آ پڑا اور یوں محسوس ہوا کہ آدمیوں کا یہ جم غفیر محض بونوں کا ایک ٹولہ ہے اور تن تارارا ان بونوں کی قد آور شہزادی ہے---- ایسی شہزادی جس کے سامنے پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ یہی وہ لمحے تھے کہ وہ شہزادیوں کی آن بان لئے میری طرف بڑھی۔

اس نے کل کی طرح آج بھی پہلے اناسا کی طرف دیکھا---- بس یہی وہ لمحہ تھا کہ اناسا کچھ کرتا۔ ورنہ اس سے اگلا لمحہ موت کا لمحہ تھا۔ اناسا نے ہاتھ اٹھا کر سردار کی طرف دیکھا۔

"سردار---- اگر یہ بے وقوف لڑکی سچائی سے باز نہیں آتی۔ اگر یہ اپنے من کے سوا کسی کی نہیں مانتی۔ اگر یہ مرنا چاہتی ہے تو اس کی سزا یہی ہے کہ اسے مرنے نہ دیا جائے۔ سردار' میں سچ کہتا ہوں"۔

اناسا فرط جوش سے کانپ رہا تھا۔ "ناگ دیوتا کی قسم---- میں سچ کہتا ہوں' اس لڑکی کی موت میں انقلاب پوشیدہ ہے۔ اس لڑکی کے غرور کو آپ شکست نہیں دے سکتے۔ یقین جانئے' اس کی آنکھوں کی روشنی میری آنکھوں میں اتر گئی ہے۔ یقین جانئے سردار۔ اس لڑکی کی خاموشی میری زبان بن کر بول رہی ہے اور آپ نہیں جانتے کہ یہ لڑکی مجھ جیسے اور کتنے نوجوانوں کے دلوں میں سما گئی ہے"۔

"خاموش"۔ سردار چیخا۔ "ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو زندگی سے ہاتھ دھو لو گے"۔

تن تارارا نے دوڑ کر اناسا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ادھر پاداما تڑپ کر سامنے آ گئی۔ سردار تخت سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔

"لڑکی' اگر تو ہوش میں نہیں ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ

تجھے قبیلے کی عزت سے زیادہ دیر تک کھیلنے کا موقع دیا جائے۔ اگر تو اس بات کی نوبت نہیں لانا چاہتی کہ تیری زبان کھینچ کر ناگ دیوتا کے منہ میں دے دی جائے تو مالا کسی کے گلے میں ڈال دے۔ اب ایک لحظہ کی دیر بھی برداشت نہیں کی جائے گی"۔

تن تارارا نے مسکرا کر اناسا کے منہ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس نے بڑے بانکپن سے سردار کی طرف دیکھا------ شدت جذبات سے اس کے ہونٹ کانپے۔ اس کے پھول کی پتی کی طرح نتھنے لرزنے لگے---- محبوب کی خاطر موت کی آرزو شعلہ بن کر اس کی آنکھوں میں لرزاں تھی۔

آہ------ جو آدمی موت سے اس طرح آنکھیں دو چار کر سکتا ہو' سردار بے چارہ اس سے کب تک آنکھ ملاتا۔ وہ سٹپٹایا' تڑپا اور خنجر نکال کر چیخا۔

"تاری۔ اب موت کے سوا تیرا کوئی علاج نہیں"۔

مگر اس سے پہلے کہ کچھ ہوتا--- تن تارارا نے مالا میرے گلے میں ڈال دی اور بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر اسے بازوؤں میں لے لیا۔

سارے قبیلے میں کہرام مچ گیا۔ سردار نے خنجر ہوا میں اچھالا۔ یہ تن تارارا کی موت کا اعلان تھا۔

دوسرے لمحے ایک تیر میری ہتھیلی کی پشت کو چیرتا ہوا تن تارارا کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے تین اور تیر اس کی پشت میں کھب گئے۔

وہ آہ کر کے تڑپی۔ اس نے سر اوپر اٹھایا۔ اس کی زخمی نگاہیں میری نگاہوں سے ٹکرائیں۔ مگر عین اسی لمحے ایک اور واقعے نے لوگوں کو مبہوت کر دیا اور ان کی چیخیں نکل گئیں۔ سردار تڑپ کر گر پڑا----- ان گنت تیروں نے اس کا جسم چھلنی کر دیا تھا۔

اناسا اور اس کی ٹولی سردار اور اس کے محافظوں پر پل پڑی تھی۔ تن تارارا کا باپ ہمارے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے سب سے پہلے وہ تیر نکالا جو میرے ہاتھ اور اس کی بیٹی کے جسم کو پرو چکا تھا۔ کچھ اور لوگ بھی ہماری مدد کو آئے--- تن تارارا بے ہوش ہو چکی تھی مگر میں اسے سینے سے لگائے ہوئے تھا۔

دوسری طرف شور و ہنگامہ برپا تھا۔ چیخ و پکار اور بھاگم بھاگ جاری تھی کہ اچانک چاروں طرف پھیلی ہوئی مشعلیں بجھ گئیں اور چار سو اندھیرا چھا گیا۔ گو اناسا نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا مگر میں جان گیا تھا کہ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت ہوا تھا۔

اب ان گنت جگنوؤں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ افراتفری اور شور و ہنگامہ بدستور برپا تھا----- بچے رو رہے تھے۔ عورتیں چیخ رہی تھیں۔ دوست دشمن کی پہچان نہ رہی تھی-- معاً" ایسے لگا جیسے تن تارارا کو زبردستی کوئی میری گرفت سے نکال رہا ہے۔ میرا ہاتھ بری طرح زخمی ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود میں نے اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اسی لمحے کسی نے ہولے سے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا اور دھیرے سے بولا۔

"چلو۔ میرا ہاتھ پکڑ لو"۔ یہ آواز اناسا کی نہ ہوتی تو بھی میں اسے پہچان لیتا۔ میرے شانے پر ہاتھ رکھنے کا یہ انداز صرف اناسا کا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ "مگر یہ تاری کو کون کھینچ رہا ہے؟

"فکر نہ کرو۔ تاری ہمارے دوستوں کی حفاظت میں ہے۔ چلو دیر نہ کرو"۔

میں نے تن تارارا کو چھوڑ دیا اور اتاسا کے ساتھ چل دیا۔

معلوم نہیں اتاسا مجھے کہاں لے آیا تھا۔ بہر حال وہ اتاسا اور تن تارارا میں سے کسی کا گھر نہیں تھا---- اتاسا مجھے یہاں چھوڑ کر پھر کہیں چلا گیا تھا۔ اس گھر میں دو بوڑھی عورتیں اور ایک جوان لڑکی تھی۔ انہوں نے میرا زخم دھویا اور جلے ہوئے کپڑے کی راکھ اس میں اچھی طرح بھر کر پٹی باندھ دی۔

یہ عورتیں بڑی توجہ سے میری دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ ان کے رویے سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ اس گھر میں میری آمد اور موجودگی کے بارے میں پوری رازداری برتی جا رہی ہے۔

میں نے تن تارارا کے بارے میں پوچھا تو ایک بڑھیا بولی۔

"بیٹا چنتا نہ کرو۔ تارو مر بھی گئی تو اتنے غم کی بات نہیں ہو گی۔ وہ پوری نسل کو جینے کا طریقہ بتا گئی ہے--- وہ اپنا کام کر گئی ہے"۔

میں نے دل میں سوچا---- یہ لوگ کس طرح متاثر ہوئے ہیں۔ جراٴت و بہادری دیکھتے دیکھتے لوگوں کے سوچ بچار کا دھارا بدل دیتی ہے۔ جب نئی قدر اور نیا احساس جنم لیتا ہے تو ایک نئی سچائی سے تعارف ہوتا ہے۔ پہلی نظر میں دنیا اسے شک و شبہ سے دیکھتی ہے مگر سچائی کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی---- جب لوگ اچانک چونک جاتے ہیں تو سمجھ لو کہ روایت اور قدامت کا جنازہ اٹھ گیا ہے۔

یہ بڑھیا جس کے بال چاندی کی طرح سفید تھے اسی برس بعد سچائی کو پہچانی تھی۔ اسی برس کے پالے پوسے ہوئے جھوٹ کو یوں چٹکیوں میں نکال پھینکنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بقول اتاسا یہ واقعی ایک انقلاب تھا۔

ذہن جب انقلاب کے معنی سمجھ جاتا ہے تو وہ اپنے سردار کے تیروں سے چھلنی جسم کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اسے اس سے بھی غرض نہیں ہوتی کہ کوئی لڑکی صدیوں کی روایات کو روند کر سردار زادے کے گلے میں مالا نہیں ڈالتی۔

نوجوان لڑکی بڑھیا کے پاس کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بھی یہی کہہ رہی تھی۔

"آدمی کو آدمی سے محبت کرنے کا حق ہے۔ محبت کو کسی ذات، کسی شخصیت اور کسی قبیلے کے لئے محدود اور مخصوص نہیں کیا جاسکتا۔ محبت کی کوئی سرحد نہیں ہوتی--- محبت کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اپنی پہچان ہوتی ہے۔ اگر دنیا کے ایک کونے کا آدمی دوسرے کونے کے آدمی کو وجدانی طور پر محسوس کرتا ہے تو یہ ایسا سچ ہے جو ہرنی اپنے نوزائیدہ بچے کے لئے محسوس کرتی ہے"۔

بڑھیا کے بالوں میں ایک بھی سیاہ بال نہیں تھا۔ مجھے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "ماں---- اتاسا سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"

بڑھیا ممتا بھرے لہجے میں بولی۔ "وہی جو تمہارے ساتھ ہے"۔

مجھے بڑھیا کے جواب سے تسلی ہوئی۔ یہ خونی نہیں ذہنی رشتہ تھا۔ میں اور اتاسا اس کے لئے برابر تھے۔ اس کا سینہ ہر تعصب سے خالی تھا۔ جیسے اس کے سفید بالوں میں کوئی سیاہ بال نہیں تھا۔

دوسری عورت کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ آپ کی بہن ہے؟"

بولی۔ "نہیں، یہ میری بہو ہے اور یہ لڑکی میری پوتی ہے۔ اس کے باپ نے چیتے کے ایک جوڑے کا شکار کرتے ہوئے نر کو تو اپنے تیر کا نشانہ بنایا مگر دوسرا تیر پھینکنے سے پہلے مادہ نے اسے ہلاک کر ڈالا"۔

شوہر کے ذکر سے اس کی بیوی آب دیدہ ہو گئی۔

"یہ حادثہ کب ہوا؟" میں نے پوچھا۔

بڑھیا نے جواب دیا۔ "نوسی نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا"۔ نوسی اس لڑکی کا نام تھا۔

"یہ ماں کے پیٹ میں تھی"۔

لڑکی نے نظریں جھکا لیں۔ وہ شرما گئی تھی۔ کٹیا کا دروازہ کھلا۔ پاداما اندر آ گئی۔ میری مرہم پٹی دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئی۔ بولی۔

"بھیا۔ تم میرے ساتھ چل سکو گے نا۔ تارو تمہیں پکار رہی ہے"۔

"ہاں ہاں پاداما"۔ میں خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا اسے ہوش آ گیا ہے؟ وہ ٹھیک ہے نا"۔

"ہاں وہ زندہ ہے۔ چلو دیر نہ کرو"۔

ہم دونوں باہر آ گئے۔ اف! بھیانک رات تھی۔ جگنو بھی اب اکا دکا نظر آ رہے تھے۔ پاداما میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اور تاریک راہوں پر وہی میری رہنمائی کر رہی تھی۔ یہ تن تارارا کی بستی نہیں تھی اس لئے یہ راہیں میرے لئے انجانی تھیں۔ تقریباً" ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک اور بستی میں داخل ہو گئے۔ یہ بھی تن تارارا کی بستی نہیں تھی۔ میں نے پاداما سے پوچھا۔

"کیا تارو یہیں ہے؟"۔

"ہاں۔۔۔۔ اس کے زخم گہرے تھے اس لئے یہیں انتظام کیا گیا۔ تم شاید بھول رہے ہو۔ یہ سردار کی بستی ہے"۔

"سردار کی بستی۔۔۔۔!" میں چونک اٹھا۔ کیا تارو یہاں محفوظ ہے؟" اس وقت ہم ایک گلی کی نکڑ عبور کر رہے تھے۔ پاداما بولی۔

"سردار اور اس کا بیٹا دونوں قتل ہو چکے ہیں۔ ان کے عزیز اور کچھ حواری شاید مقابلہ کریں لیکن قبیلے کے زیادہ تر لوگ ہمارے ساتھ مل گئے ہیں"۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ اتاسا کس بلا کا آدمی ہے۔ کس احتیاط اور رازداری سے اس نے پورے قبیلے میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی تھی۔ اس نے مجھے بھی کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ ظاہر تھا کہ جو شخص اس قدر ذہین اور محتاط تھا' وہ ناکامی کا منہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

تن تارارا سوکھی گھاس پر سو رہی تھی۔ آٹھ دس لڑکیاں اس کے ارد گرد بیٹھی تھیں۔ میں اور پادادما کٹیا میں داخل ہوئے تو سب لڑکیاں اٹھ کھڑی ہوئیں مگر نہ اٹھی تو تن تارارا۔۔۔۔ اس نے ہمیں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ میں نے نگاہ اٹھائی تو لڑکیوں کی نگاہیں جھک گئیں۔ اب مجھے کوئی کنکھیوں سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ خون شاید بہت زیادہ بہہ گیا تھا اسی لئے اس کا خوبصورت چہرہ زرد تھا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

پادادما آگے بڑھی۔ اس نے تن تارارا کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ پھر بڑے پیار سے اپنا ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر بولی۔

"تارو۔۔۔۔ پردیسی آ گیا ہے"۔

تن تارارا کچھ نہ بولی۔ اس کا منہ بند تھا۔ اکثر سوتے میں اس کے یاقوتی ہونٹ نیم وا رہتے اور آدھ کھلے دہن میں اس کے برف کی طرح سفید دانت ذرا ذرا سے نظر آتے تھے جیسے دور کوئی ستارہ چمک رہا ہو۔ لیکن آج اس کا منہ بند

تھا۔

پاداما نے پھر میری طرف نگاہ نہ اٹھائی۔ وہ اس کے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ نقاہت سے میرے پاؤں کانپنے لگے۔ میں وہیں تن تارارا کے پیروں میں بیٹھ گیا۔ پاداما کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور وہ اسے پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"پاداما تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ تن تارارا مجھے پکار رہی ہے"۔

پاداما پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سب لڑکیاں حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اب کسی جھوٹے سہارے پر یقین کرنا بے کار تھا۔ کوئی آسرا کام نہیں دے سکتا تھا۔ خوش فہمیوں کا وقت گزر چکا تھا---- تن تارارا مرچکی تھی۔

آہ---- خدایا۔ یوں نامکمل دنیا بنانے میں کیا مصلحت تھی؟ یہ لڑکی' یہ سرگم کی راگنی۔ تو نے محبت کے ڈھیر سارے موتی اس کے سینے میں بھر دیے اور لٹانے کا وقت آیا تو ایک موتی لٹانے پر بھی اسے اختیار نہیں تھا۔ کوئی پوچھے جہاں جذبے کا یوں خون ہوتا ہو اس ہستی کو مکمل کون کہے گا۔

یہ بند کلی جو کھلتے کھلتے رہ گئی۔ کون جانے پھر کب کھلے گی' کہاں کھلے گی۔ یہ ادھورے سپنے زندگی کے ارد گرد تانا بانا کیوں بنتے ہیں؟ ارمان حسرتوں میں کیوں بدل جاتے ہیں؟ اوہ۔ خدایا۔ ایسا کیوں ہے؟ کیوں ہے؟

میں نے سر اس کے پیروں پر رکھ دیا۔ جب میں سو رہا ہوتا تو وہ اپنا سر میرے پیروں پر رکھ دیتی تھی--- آج وہ سو رہی تھی تو میں نے اپنا سر اس کے پیروں پر رکھ دیا تھا۔

یہ بہت ہی سادہ سا رشتہ تھا۔ اس میں کوئی پیچ نہیں تھا۔ مجھے زندگی نے یہی دیا تھا۔ مجھے اس سے زیادہ کی ہوس بھی نہیں تھی۔

تن تارارا مرچکی تھی۔

سردار اور اس کا بیٹا بھی مرچکا تھا۔ بلونت سنگھ مرچکا تھا۔ مہردین مرچکا تھا اور کمل رام بھی مرچکا ہوگا۔

ہر موت میں ایک پیغام پوشیدہ ہوتا ہے۔ انسان مرجاتا ہے مگر اس کا پیغام نہیں مرتا--- المیہ یہ ہے کہ سچائی زندہ رہتی ہے مگر پھر بھی دنیا کو مکمل کوئی نہیں کہہ سکتا۔

اوتار' مہاتما اور پیغمبر آئے۔ لیکن شیطانیت پھر بھی زمین پر پلتی رہی۔ غالباً" مصلحت یہی تھی کہ بدی اور نیکی شانہ بشانہ چلتے رہیں۔ ورنہ مکمل دنیا تو موت کے مترادف ہوتی۔

تن تارارا ابدی نیند سو رہی تھی۔ ایک لہر آتی۔ مجھے جذباتی بنا جاتی۔ ایک لہر آتی مجھے منطقی بنا جاتی۔ اس کی موت پر تنقید بھی کر رہا تھا۔ اس کی موت کو داد بھی دے رہا تھا۔ وہ فاتح بھی تھی' مظلوم بھی تھی۔

زندگی ایک ایسا امتحان ہے کہ اس دوڑ میں آگے نکل جاؤ تو بھی اکیلے۔ پیچھے رہ جاؤ تو بھی اکیلے۔

جبھی تو میں بار بار سوچ رہا تھا کہ یہ دنیا مکمل نہیں ہے۔ تن تارارا چھن گئی۔ چھیننے والوں کو بھی نہ مل سکی۔ کسی نے کسی کی بھی نہ بننے دی--- بھلا ایسی دنیا کبھی مکمل ہو سکتی ہے۔

تن تارارا کا جسم ابھی تک خون آلود تھا۔ اس خون میں ابھی تک نمی تھی۔ اس نمی میں اس کی محبت کا احساس رچا بسا ہوا تھا۔ اور اس احساس نے

میری روح کو سرشار کر رکھا تھا--- اور یہی سرشاری فریب ہستی کو پہچاننے میں میری معاون ثابت ہو رہی تھی۔

یہ وہی لڑکی تھی جس نے بھرے قبیلے میں رسم کے مطابق ایک کے بجائے دو بار جگنو مالا میرے گلے میں ڈالی تھی---- دوسرے لفظوں میں یہ میری بیوی تھی۔

لیکن تماشا یہ تھا کہ محبوبہ کی صورت میں تو وہ میرے قریب تھی مگر بیوی بنا کر میں اسے چھو بھی نہ سکا۔ زندگی نے کتنا بڑا ظلم مجھ پر ڈھایا تھا۔

اب میں زندہ رہوں گا' کون سی امید اور کس آرزو کے لئے۔ ایک راستہ ہے کہ باقی زندگی بنی نوع انسان کی خدمت کرتے ہوئے گزار دوں۔ بے شک اس عمل میں تسلی اور تسکین ہے۔ کسی کے زخم پر پھاہا رکھنا۔ کسی دکھی کے دکھ بانٹ لینا۔ پیار شاید اس سے کم درجے کی سعادت ہو---- مگر فطرت کے لئے یہ بھی تو لازم تھا کہ وہ مجھے اتنا ہی بڑا ظرف دیتی۔

میں اپنے اس چھوٹے پن کا کیا کروں کہ نیکی کی ہزار خواہشوں کے ساتھ ساتھ تن تارارا کی جدائی کا دکھ بھی سینے میں پالتا ہوں۔

اور پھر یہ ہوا کہ اس نیکی اور اس دکھ میں سدا کی جنگ ہوتی رہے اور زندگی کو کوئی راہ نہ سوجھے اور آخری سانس تک یہ فیصلہ نہ ہو سکے کہ میرا دکھ بڑا تھا یا میری نیکی کی خواہش عظیم تھی۔ خواہشوں کے اتنے انبار اور فطرت کے ایسے تضاد۔ نہ جینا اپنی مرضی سے' نہ مرنا اپنے اختیار سے۔

میں زندہ ہوں اور مجھے زندہ رہنا ہو گا۔ مگر کس کی خاطر؟ کس کے سہارے؟

کیا اس کہانی کو سنانے کی خاطر مجھے جنم ملا تھا-----؟ زندگی میں تن تارارا کی محبت سے بڑھ کر کوئی سعادت میں پا نہیں سکا اور زندگی میں تن تارارا کی جدائی سے بڑھ کر کوئی دکھ میں محسوس نہیں کر سکا۔ اوہ---- خدایا---- میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟



اتاسا نے اس روز میرے ایک زور دار تھپڑ رسید کیا۔

میں چند لمحے اسے حیرت سے دیکھتا رہا اور پھر مسکرا پڑا۔ وہ زار و قطار رونے لگا اور بے ساختہ مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونا خنجر کی نوک کی طرح اپنے سینے میں اترتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ بڑے پیار سے اس کا سر اٹھا کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ "تم تو جوان مرد ہو' اتاسا"۔

وہ بلبلا اٹھا۔ "تم نے دو ماہ سے چپ سادھ رکھی ہے۔ شکر ہے کہ تم بولے تو۔ میں پاداما کا احسان کبھی نہ اتار سکوں گا۔ تم کبھی کے مر کھپ گئے ہوتے اگر یہ لڑکی تمہاری دیکھ بھال نہ کرتی"۔

کٹیا کے دروازے میں پاداما کھڑی تھی اور بے حد پیار سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"بھیا----" وہ مسکرائی۔

"ہاں ہاں' تو اتاسا کی بیوی اور میری بہن ہے"۔ میں نے دل میں کہا۔

اس کی آنکھوں میں کس قدر ہمدردی اور پیار امڈ آیا تھا۔

اتاسا اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہیں بچوں کی طرح کھلاتی پلاتی اور سلاتی رہی ہے۔ یہ میری بیوی ہے مگر میں سچ کہتا ہوں۔ اس نے تمہیں دوسری بار جنم دیا ہے۔ یہ تمہاری ماں ہے۔ اس نے ایک بالغ اور جوان بیٹے کو جنم دیا ہے"۔

میں نے بڑے فخر سے پاداما کی طرف دیکھا۔ وہ بچوں کی طرح لجائی شرمائی جا رہی تھی---- میں پاؤں چھونے کے لئے آگے بڑھا تو وہ ہنستی ہوئی باہر بھاگ گئی۔

میں نے اتاسا کی طرف دیکھا وہ بہت خوش اور مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے حسب معمول میرے کندھے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھا۔

"پردیسی" سب جھگڑے نمٹ چکے ہیں۔ ہم نے نیا سردار چن لیا ہے۔ اب کم از کم پچاس برس تک کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں ہو سکتی۔ پچاس برس میں نئی نسل بن جائے گی۔ تب شاید پھر سے روایتی زندگی کا آغاز ہو مگر اس مدت میں پھر کوئی نیا اتاسا پیدا ہو جائے گا اور پھر سے روایتی زندگی کی جڑیں کاٹ دے گا"۔

"اتاسا ہمیشہ کی طرح تر و تازہ تھا اور اس کی باتیں ہمیشہ کی طرح دلکش تھیں۔ میں نے اس کی چمکتی دمکتی آنکھوں میں جھانکا۔

"اتاسا' تمہاری جنگ ختم ہو چکی ہے۔ تم اپنا کام سمیٹ چکے ہو۔ تم نے اور تمہاری بیوی نے میری جان بچائی ہے۔ یہ احسان میں عمر بھر یاد رکھوں گا۔ تن تارارا کی موت کے بعد اگر تم لوگوں نے مجھ پر جینے کی ذمہ داری ڈال دی ہے تو مجھے تم لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہئے۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ آدمی

کو زندہ رہنا چاہئے کیونکہ صحیح معنوں میں زندہ رہنا مرنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ میں نے جدوجہد جاری رکھنے کا خیال ترک نہیں کیا۔ تن تارارا کی موت کا غم اتنا خوبصورت ہے کہ میں بے مایہ ہونے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔۔۔۔

"یہ دو مہینے بلا شبہ روحانی کرب اور اذیت میں گزرے۔ لیکن میں وجدانی طور پر غافل نہیں تھا۔ لاشعوری طور پر میں اپنی کھوئی ہوئی محبت' کھوئی ہوئی ہمت اور کھوئی ہوئی طاقت کو یک جا کرنے میں مصروف تھا۔۔۔۔ تم نے جس گھڑی مجھے تھپڑ مارا تھا میں روحانی مدہوشی کے عالم میں زیست و فرار کے دوراہے پر کھڑا تھا۔۔۔ جس طرح مرغی کا ننھا بچہ باز کو منڈلاتا دیکھ کر شعوری طور پر نہیں بلکہ وجدانی طور پر ماں کے پروں کے نیچے چھپ جاتا ہے بالکل اسی طرح تمہارے تھپڑ نے میری جینے کی امنگ کو جگا دیا تھا۔ میں نے تمہارے دکھ' ہمدردی اور محبت کو محسوس کر لیا تھا اور میں مسکرا دیا تھا۔ یہی وہ آسمانی تعلق ہوتا ہے جو روح کو گدگداتا ہے۔ اس کو بالیدگی بخشتا ہے' زیست کی راہوں کو روشن کرتا ہے' انسانیت کے جذبے کو رواں دواں رکھتا ہے اور احساس کی آنچ کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیتا"۔

اتاسا مسکرا رہا تھا اس کی آنکھیں اور زیادہ گہری ہو گئی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ کر اسے جھنجھوڑا۔

"اتاسا' میں واپس جانا چاہتا ہوں' اپنے وطن' اپنے دیس۔ میں انگریزی فوج کا سپاہی ہوں اور جاپانی فوج کا قیدی۔ میں جاپانی قید سے بھاگا تھا' اب یہ مہم پھر شروع کرنا چاہتا ہوں"۔

اتاسا کسی قدر حیران ہوا۔ میں نے یہ باتیں پہلے اسے نہیں بتائی تھیں۔۔۔۔ بیرونی دنیا کے بارے میں ویسے بھی وہ لوگ کم جانتے تھے۔

"کیا تم ہمیشہ کے لئے چلے جاؤ گے؟"۔

"ہاں اتاسا۔۔۔ میرے ماں باپ ہیں' بہن بھائی ہیں۔ میرا گھر ہے۔ میرا وطن ہے۔ سوچا تھا تن تارارا کا تحفہ لے کر اپنے وطن جاؤں گا۔ لیکن قسمت میں یہ نہیں تھا کہ خوابوں کی پری کو کوئی سچ مچ حقیقت کے روپ میں دیکھ لے۔۔۔ اتاسا میں سچ کہتا ہوں' صدیوں کے بعد ہی کوئی ایسی کہانی بنتی ہے۔ کروڑوں اور اربوں میں ایک آدھ ہی خوش نصیب ہوتا ہے جو خواب جیسی حقیقتوں سے دو چار ہوتا ہے۔ لوگ اس کی کہانی سنتے ہیں' محظوظ ہوتے ہیں۔ دل سے مانتے ہیں مگر زبان سے اقرار نہیں کرتے"۔

اتاسا نے کہا۔ "اگر کوئی حادثہ سو برس میں ایک بار ہو سکتا ہے تو عقل اسے مان سکتی ہے"۔

میں نے کہا۔۔۔ "محیر العقول واقعات پر لوگ حیرت کا اظہار بھی کرتے ہیں اور دل میں داد بھی دیتے ہیں مگر مجھے اس کی پروا نہیں۔ لوگ مانیں یا نہ مانیں' میں اب اس لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں کہ ساری دنیا کو تن تارارا کی کہانی سناؤں۔ یہ بہت رنگین' پراثر اور غیر معمولی کہانی ہے۔۔۔۔ یہ ایسی سنگین حقیقت ہے کہ سچ مچ اس پر تخیل کا گمان ہوتا ہے۔۔۔۔

"میں بڑائی نہیں کر رہا۔ میں اس آدمی کے سامنے اترا نہیں سکتا' جس کی میں عزت کرتا ہوں۔ میری عمر اتنی زیادہ نہیں اور نہ میں نے زیادہ دنیا دیکھی ہے اس لئے میں نے ابھی تک جھوٹ بھی نہیں سیکھا۔ جو محسوس کرتا ہوں کہہ دیتا ہوں"۔

اتاسا ہنس پڑا۔ اس نے عادت کے مطابق میرے دونوں کندھے بڑی اپنائیت سے دبائے۔

"پردیسی' تم میرے دوست ہو دوست- بس اس سے بڑی اور سیدھی بات دوسری نہیں ہو سکتی- تمہاری ہر ادا مجھے پیاری لگتی ہے میں نے تمہیں شروع ہی سے سمجھا ہے- تم مجھے اس وقت بھی اچھے لگتے تھے جب میری اور تمہاری شناسائی نہ تھی اور پھر جب مجھے پادااما کی زبانی تمہاری اور تن تارارا کی محبت کا علم ہوا تو حیرت اور حسد کے بجائے خوشی ہوئی تھی کیونکہ تن تارارا جیسی لڑکی کی محبت کے اہل صرف تم ہی تھے- تم سا آدمی ہمارے قبیلے میں نہیں تھا اور تن تارارا کی تو خیر کوئی مثال ہی نہ تھی"-

اناسا نے تن تارارا کا ذکر کچھ اس طرح چھیڑا کہ میری آنکھیں یکبارگی چمک اٹھیں اور ہونٹ کپکپانے لگے- اس نے مجھے گلے لگایا اور بہت ہی پر سکون---- پیار بھرے لہجے میں بولا-

"تم نے ابھی تک اس کی موت پر ایک آنسو بھی نہیں بہایا- اچھا ہوا کہ تمہیں رونا آگیا- مجھے ایک بڑھیا نے بتایا تھا کہ تمہارے دل کی بھڑاس نکلنی بہت ضروری ہے ورنہ تم پاگل ہو جاؤ گے- میں نے تمہیں تھپڑ بھی اسی لئے مارا ہے- شکر ہے کہ تمہارے آنسو نکل آئے"-

میں اناسا کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا- وہ پیار سے میری پیٹھ تھپتھپاتا رہا- میرے رونے کی آواز سن کر پادااما بھی اندر آگئی- جب میں اناسا کی چھاتی سے الگ ہوا تو خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا-

اناسا نے پادااما کو دودھ کے لئے کہا- وہ چلی گئی- پھر اس نے مجھے کٹیا کے فرش پر بچھی ہوئی گھاس پر بٹھایا اور پر عزم لہجے میں بولا-

"تم واپس جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ- ہمارے قبیلے کا دستور ہے کہ اس وادی کے چاروں طرف پھیلے ہوئے پہاڑوں کو ہم عبور نہیں کر سکتے- لیکن تمہاری خاطر میں ان پہاڑوں کے اس طرف بھی جھانک سکتا ہوں- جہاں تک تم کہو گے میں تمہارے ساتھ جاؤں گا---- تم خوش نصیب ہو کہ تن تارارا نے تم سے پیار کیا- وہ سچی تھی' حسین تھی- اس نے صدیوں کی روایات کو للکارا- تخت کو دھتکارا- ایسی لڑکی جسے صدیوں تک ہمارا قبیلہ یاد رکھے گا تمہاری محبت کا دم بھرتی رہی ہے اور تمہاری خاطر موت کے گھاٹ اتری ہے- تن تارارا کے ناتے لوگ تمہیں بھی یاد رکھیں گے- پھر نئی نسل آئے گی- تم اس کے لئے افسانہ بن جاؤ گے- ہر دل میں یہ حسرت ہو گی کہ وہ پردیسی کون تھا؟ کیسا تھا؟ تھا بھی یا نہیں؟---- پردیسی' ہر لڑکی جو اس وادی میں جوان ہو گی' سوچے گی- کاش کوئی بھولا بھٹکا پردیسی اس وادی میں پھر آجائے- پھر آجائے مگر ہر لڑکی تن تارارا کی تقدیر کہاں لاتی ہے- ہر بار مسافر کہاں بھٹکتے ہیں---- پردیسی' تم بہت دھنی ہو- تم اس وادی کی ساری دھن دولت ساتھ لئے جا رہے ہو- ہمیں یاد رکھنا- بھولنا نہیں"-

اناسا کچھ جذباتی ہو گیا تھا- تن تارارا کے مرنے کے بعد بھی جب اس نے مجھے یہ محسوس کرایا کہ میں بہت خوش نصیب ہوں تو مجھے معاً ایک خیال آ گیا- میں نے اس سے پوچھا-

"اناسا' تم اور پادااما بھی تو ایک دوسرے کو بے پناہ پیار کرتے ہو- تن تارارا مر گئی- تم مجھے خوش نصیب کہتے ہو- تمہیں پادااما مل گئی- کیا تم مجھ سے زیادہ خوش نصیب نہیں ہو؟"-

"نہیں' پردیسی نہیں"- اناسا نے کہا- "ہمارے دیس میں جو لڑکی جس سے محبت کرتی ہے وقت آنے پر اسی کے گلے میں مالا ڈال دیتی ہے- یہاں محبت کو کبھی آزمائش کا موقع نہیں ملتا- وہ بڑی سادگی اور اطمینان سے ایک دوسرے کے

بن جاتے ہیں- وہ انتظار کی کوفت ضرور اٹھاتے ہیں مگر تڑپنے کی لذت سے نا آشنا رہتے ہیں- میں جب تم سے اپنا مقابلہ کرتا ہوں تو خود کو بے حد حقیر محسوس کرتا ہوں"-

عین اسی لمحے پاداما دودھ لائی---- میں نے اسے غور سے دیکھا- وہ کس قدر سادہ' مخلص' پیاری لڑکی تھی- میں نے اس کے ہاتھ سے دودھ کا بھرا ہوا پیالہ لے لیا اور سارا دودھ غٹا غٹ پی گیا- دودھ کی مٹھاس اور ذائقے کو میں نے پوری طرح محسوس کیا-

خالی پیالہ واپس کرنے لگا تو پاداما بولی-

"اور لاؤں بھیا؟"

"بس' اب گنجائش نہیں"-

دن گزر گیا- رات آئی- یہ جگنوؤں کی وادی کی آخری رات تھی جو اس کشمکش اور اذیت میں گزر گئی کہ کل مجھے تن تارارا کے دیس کو چھوڑ دینا ہے-



جگنوؤں کا دیس چھوڑ کر میں کہاں کہاں بھٹکتا پھرا؟ یہ بہت طویل کہانی ہے-

کیلنڈر' دن اور تاریخ کا کوئی حساب نہ تھا- کم و بیش تین ماہ کے بعد میں نے انسان کی شکل دیکھی- یہ برما کا سرحدی قبائلی علاقہ تھا-

سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھ چکے تھے- آئینہ دیکھا تو حیران رہ گیا- آنکھوں کے سوا میرا تمام چہرہ سیاہ اور گھنے بالوں میں چھپ گیا تھا-

مانڈلے پہنچا تو جنگ ختم ہو چکی تھی- جاپان ہار چکا تھا- اتحادی جیت گئے تھے---- ناگا ساکی اور ہیروشیما تباہ ہو چکے تھے' ایٹم بموں سے-

مانڈلے کی پولیس نے مجھے رنگون پہنچا دیا اور رنگون کی پولیس نے سنگا پور---- میں حراست میں تھا مگر ہتھکڑی نہیں لگی تھی- جو کہانی میں نے سنائی اس پر کسی نے یقین نہ کیا- تمام ہندوستانی یونٹیں واپس جا چکی تھیں- ہماری یونٹ کا کوئی فوجی ریکارڈ سنگاپور میں نہیں تھا- مجھ پر جاسوس ہونے کا شبہ بھی کیا

گیا۔

سنگا پور سے ایک بحری جہاز کے ذریعے مجھے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ بندرگاہ پر ہندوستان کی ملٹری پولیس میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ پندرہ دن ملٹری پولیس کے کوارٹر گارد میں رہنے کے بعد میرے طلبی کے کاغذات آئے تو مجھے ایک ملٹری گارڈ کی حراست میں دہلی بھیج دیا گیا۔

دہلی میں بھی مجھے ایک فوجی یونٹ کے کوارٹر گارد میں رکھا گیا۔ چند دن کے بعد ایک سکھ کیپٹن انکوائری کے لئے آیا۔ میں نے من و عن سارا قصہ سنایا۔ وہ سنتا رہا اور میرا مذاق اڑاتا رہا۔ کبھی کبھی سنجیدہ بھی ہو جاتا اور بڑے غور سے میری باتیں سنتا۔

اس نے جا کر آفیسر میس میں یہ باتیں بتا دیں۔ دوسرے دن جب ایک انگریز میجر اور لیفٹیننٹ مجھے دیکھنے آئے تو چند لمحے کوارٹر گارد کی کوٹھری کے باہر چپ چاپ کھڑے رہے۔ میں اٹھ کر دروازے کی سلاخوں کے پاس آگیا اور انہیں سلام کیا۔ میرے سلام کے ہلکے سے تمسخر کو میجر نے محسوس کیا مگر بجائے غصے ہونے کے ہنس پڑا۔

ان کے جانے کے بعد گارد کمانڈر نے بتایا کہ یہ میجر عام گورا نہیں ہے بلکہ ایک پڑھا لکھا انگریز ہے۔ کرنل اور بریگیڈیئر تک اس کی عزت کرتے ہیں۔

چند دن بعد ہماری یونٹ کے ریکارڈ آفس سے اطلاع آئی کہ اس نام اور نمبر کے سپاہیوں کے نام جنگی قیدیوں کی فہرست میں درج ہیں لیکن جاپانی حکومت کی رپورٹ کے مطابق یہ چاروں سپاہی مارے جا چکے ہیں اور ان کے ورثا کو ان کی موت کی اطلاع دی جا چکی ہے۔

چٹھی کے آخر میں درج تھا۔ "مزید کاروائی کے لئے سپاہی مذکور کو ریکارڈ آفس کے ہیڈ کوارٹر بھیج دیا جائے"۔

میں اپنے ہیڈ کوارٹر فیروز پور پہنچا تو ان سپاہیوں اور عہدہ داروں نے مجھے پہچان لیا جو میرے ساتھ رنگروٹ رہ چکے تھے۔ ہماری یونٹ کے جونیئر اور سینئر افسر جو ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے' مجھے حیرت اور خوشی سے دیکھ رہے تھے۔ ایک ایک نے مجھے پہچان لیا تھا۔ ایک آدمی جو حالات کی ستم ظریفی سے مردہ تصور کیا جا چکا ہو' اچانک سامنے آ جائے تو دیکھنے والوں کا رد عمل دیکھنے والا ہوتا ہے۔

ایک دن اور ایک رات کوارٹر گارد میں رہ کر اگلے روز میری پیشی ہوئی۔ ضروری کارروائی' پوچھ گچھ اور تصدیق کے بعد مجھے سپاہیوں کے ساتھ بیرکوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ کمانڈنگ کا رویہ بہت ہی مشفقانہ تھا۔ وہ مسلسل ڈیڑھ دو گھنٹے تک میری داستان سنتا رہا۔ انگریز کرنل نے مسکرا کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"ویل جوان ویل' اگر تم مر جاتے تو تمہاری کہانی رومیو سے بھی زیادہ خوبصورت ہوتی۔ مگر پھر مشکل یہ ہوتی کہ ہمیں یہ داستان کون سناتا"۔

کرنل نے میری دو ماہ کی چھٹی منظور کر لی اور ساتھ ہی آرڈر کر دیا کہ میرے زندہ سلامت بچ جانے کی اطلاع میرے گھر کر دی جائے۔ اس کے علاوہ مجھے بھی تاکید کی گئی کہ پہلی فرصت میں والدین کو خط بھیجوں لیکن والدین کو خط لکھنے سے پہلے میں نے ریکارڈ آفس سے کمل رام' مہردین اور بلونت سنگھ کے ورثا کے پتے لے کر ان کو تفصیل سے خط لکھے۔

مہردین کی بیوہ ماں نے جواب میں لکھا۔

بیٹا۔

مہردین کے جنگ میں کام آ جانے کی اطلاع مجھے سرکاری طور پر مل چکی

تھی اور اس کی پنشن بھی مجھے مل رہی ہے مگر اس کی موت کی کہانی جو تم نے بیان کی ہے' میں تمہاری زبان سے بھی سننا چاہتی ہوں۔

جب تم چھٹی پر آؤ تو مجھے خط لکھنا۔ میں تمہارے گاؤں آ جاؤں گی۔ بیٹے' یہ تو تم نے لکھا ہی نہیں کہ اسے گولی کہاں لگی تھی؟ وہ کتنی دیر تڑپا تھا؟ اور کتنا خون بہا تھا؟ مجھے تو اس نے بار بار یاد کیا ہو گا؟

مہردین کی ماں

بلونت سنگھ کے گھر والوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

لیکن مجھے وہ گھڑی ہمیشہ یاد رہے گی جب آر پی کا ایک لانس نائیک ایک بوڑھے کو ہماری بیرک میں لے آیا تھا۔ میں ٹرنک میں کپڑے بند کر رہا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

"یہ تمہارا مہمان ہے اسد"۔

میرے علاوہ اور بھی سپاہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ شکل و صورت سے وہ کسان لگ رہا تھا۔ بڑی بڑی لٹکی ہوئی مونچھیں۔ گہری اور عقابی آنکھیں۔ میرے لئے قطعا" وہ اجنبی تھا۔

وہ میرا مہمان تھا مگر میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چند لمحے ہم ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ یہ بڑے مختصر لمحے تھے مگر بے حد پر اسرار۔ اجنبی کی نگاہوں میں سختی بھی تھی اور نرمی بھی۔

"جی---- میرا نام اسد ہے"۔ میں ایک قدم آگے بڑھا۔

اجنبی اسی طرح چپ چاپ کھڑا رہا۔ مجھے اس سے خوف محسوس ہوا۔

اگلا لمحہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھا۔ اجنبی کے ہونٹوں پر خفیف سی لرزش ہوئی---- اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"میں کمل رام کا باپ ہوں"۔

آہ---- یہ کمل رام کا باپ تھا---- یہ آدمی کمل رام کا باپ ہی ہو سکتا تھا۔ یہ اس آدمی کو دیکھنے آیا تھا جس کے لئے اس کے بیٹے نے جان دی تھی۔ بس یہی ایک رشتہ تھا جس کے لئے گڑ گاؤں سے یہ جاٹ چل کر آیا تھا۔

آہ-----! زندگی ایسے ہی لمحوں میں خوبصورت لگتی ہے' ورنہ اس نچی کھچی دنیا میں رکھا ہی کیا ہے؟ یہاں کوئی کام اپنی مرضی سے نہیں ہوتا۔ بڑی سے بڑی قیمت پر بھی ہم خوشی نہیں خرید سکتے---- لیکن جب خوشی کا لمحہ آتا ہے تو سات آسمانوں کا سینہ چیر کر ہمارے دلوں میں اتر جاتا ہے۔

اور یوں ہمیں زندہ رہنے کا آسرا مل جاتا ہے۔

انسانیت انہیں جذبوں سے عبارت ہے



جب میں گھر پہنچا تو وہ دن عام دنوں کی طرح نہیں تھا۔

میری ماں میرے گلے سے لگی ہوئی تھی اور وہ اس طرح رو رہی تھی جیسے میری لاش گھر آئی ہے---- یقیناً" میری لاش آنے پر بھی وہ اسی طرح بین کرتی۔

انتہائے مسرت کا یہ روپ بالکل انتہائے غم کی طرح تھا۔ میرا دل بھی بھر آیا تھا۔ مگر میں اپنی روح میں گدگدی محسوس کر رہا تھا اور میرا سینہ ایک قوی احساس سے بھر گیا تھا۔

دیر تک ماں مجھ سے لپٹی رہی۔ باقی لوگ ہمارے ارد گرد کھڑے تھے۔ کسی کی ٹھوڑی کانپ رہی تھی' کسی کے ہونٹ لرز رہے تھے کسی کی پلکوں پر آنسو رقصاں تھے اور کوئی زار و قطار رو رہا تھا۔ شدت جذبات کا یہ عالم انوکھا تھا۔

فردا" فردا" میں ہر آدمی سے ملا- اپنوں سے بھی' پرایوں سے بھی- ماں کی محبت کی گرمی اور تھی- باپ کی شفقت اور محبت میں کچھ اور لطف تھا- بہن نے کچھ اور احساس دیا- بھائی نے کچھ اور- ہر مختلف رشتے نے مجھے مختلف خوشی سے نوازا-

چند دن ہنستے کھیلتے گزر گئے- پھر نشہ اترنے لگا- دل گرفتگی بڑھنے لگی- جذبات کا طوفان اعتدال پر آگیا اور زندگی جمود کی طرف بڑھتی محسوس ہونے لگی-

ہر آنے والا دن پچھلے دن کی طرح بے مقصد--- ہر لمحے کے بعد دوسرے لمحے کا بوجھ--- راتوں کی یکسانیت' نہ امنگ نہ ترنگ---- نہ توانائی- ذہن خالی خالی- دماغ بانجھ بانجھ اور روح ویران ویران- کچھ عجیب سی بے حسی کی آمد آمد تھی-

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں آگیا ہوں اور مجھے کہاں جانا ہے' نہ منزل نہ منزل کا نشان- کیا میرا ماضی ہی میرا مستقبل تھا؟

یہ فاصلہ---- یہ تعطل---- یہ سناٹا---- یہ خلا---- زمانہ آگے بھاگ رہا ہے- میں پیچھے کی طرف دوڑوں- یہ فاصلہ کیسے طے ہو گا؟

یہ سائنس کی صدی ہے- لوگ پلک جھپکتے میں افق کے اس پار جھانک آتے ہیں لیکن میرے ذہن میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے' اس کی طنابیں کون کھینچے گا؟ کہاں ہے وہ پیامبر---- جو موت کی وادی تک میرا سندیسہ پہنچا سکے اور تن تارارا سے کہہ سکے کہ تو جو اس اجنبی دنیا میں ایک دیوانے کو چھوڑ کر چلی گئی ہے' اس کی بپتا کون سنے گا؟"

یہاں تو کوئی اس کی زبان ہی نہیں سمجھتا- یہاں سب دانشور بستے ہیں- وہ مادے کی بات کرتے ہیں' روح کی نہیں- وہ لہو کے قطرے کو مانتے ہیں' احساس کو نہیں- اگر لہو کا قطرہ ہی سچائی ہے' احساس کچھ نہیں تو پھر یہ احساس میری روح پر کیوں چھایا ہوا ہے؟ خون کے قطرے کو تو جب چاہوں جسم سے خارج کر سکتا ہوں مگر احساس میں چاقو نہیں چبھتا اور نہ کھرچ کر اسے روح سے الگ کیا جا سکتا ہے-

لوگوں نے کہا کچھ عرصہ انتظار کروں کہ جذبات کا طوفان تھم جائے اور میں زندگی کی رعنائیوں کو پہچاننے کی اہلیت پیدا کرلوں- یعنی زندگی مختلف ادوار کا مجموعہ ہے-

ایک دور بچپن اور لڑکپن کا ہے کہ آدمی ہنستا کھیلتا اور سیکھتا ہے- دوسرا دور جوانی کا ہے کہ خون جوش مارتا ہے اور انسان محبت کرتا ہے- تیسرا دور اعتدال کا ہے کہ لہو کی حرارت میں کمی آ جاتی ہے اور آدمی زندگی کے ٹھوس حقائق سے روشناس ہوتا ہے-

احباب مجھے اسی دور کے انتظار کے لئے کہہ رہے تھے جب میرا لہو کھول کھول کر جل جائے گا- میرے اعضا تھک جائیں گے اور میرا شعور کند ہو جائے گا- پھر وہ نعرہ بلند کریں گے کہ میں نے حیات کے حسن کدہ میں سے اپنے حصے کی رعنائیاں الگ کر لی ہیں- میں زندگی کو سمجھ گیا ہوں اور اس کے مفہوم سے مطمئن ہو گیا ہوں-

لیکن یہ دور بھی گزر گیا- دوست ہار کر چپ ہو گئے- اپنوں اور پرایوں کے اصرار کا کوئی نتیجہ نہ نکلا- لیکن جب میں نے ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو دل پسیج گیا- وہ کیسی بے کس اور مظلوم نظر آ رہی تھی- کیسی مختصر مختصر خوشیاں ہوتی ہیں ہم لوگوں کی---- مجھے اپنے ارد گرد کی دنیا بالکل بچوں کی

طرح لگ رہی تھی جو معمولی معمولی کھلونوں سے بہل جاتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ لوگ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں جو خوشی اور سکھ کی ایک خاص حد سے آگے سوچ نہیں سکتے۔ ان کے دکھ اتنے گھمبیر نہیں ہوتے کہ انہیں بھول نہ سکیں اور نہ ان کی خوشیاں اتنی پراسرار ہوتی ہیں کہ تلاش کرنے سے ہاتھ نہ آئیں۔

میں اگر نئی انوکھی باتیں سوچنے لگا تھا۔ میں اگر ان کی دنیا کا آدمی نہیں تھا تو اس میں ان بے چاروں کا کیا قصور---- انہیں اپنے حصے کی خوشی ملنی چاہئے تھی--- بہو، پوتے، پوتیاں۔ میں ان لوگوں سے الگ نہیں رہ سکتا۔ یہ لوگ مجھ سے وابستہ ہیں۔ یہ مجھے اپنا سمجھتے ہیں۔ ان کے کچھ دعوے ہیں۔

ان کی جو خوشی ہے اسی میں یہ میری خوشی بھی سمجھتے ہیں۔ وہ بڑی دیانت سے یہ سب کچھ سوچتے ہیں۔ بڑے سیدھے سادے لوگ ہیں۔ میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

میں نے ماں کی پیشانی چوم لی۔

میں نے ہار مان لی۔

ماں کے ہونٹ کپکپائے۔ وہ روتے روتے ہنس پڑی۔ اس نے زمین کی ساری سچائی سمیٹ کر کہا۔ "میں نے تمہارے لئے چاند سی دلہن تلاش کر لی ہے، بیٹا"۔

روئے زمین کی ہر ماں کی طرح اس کے اس دعوے میں سچائی تھی۔ ہر ماں اپنی بساط کے مطابق مہرو ماہ ہی تلاش کرتی ہے۔ کاش---- ماں کا دل کائنات کا خمیر ہوتا۔

* * *

دوستو!

یہ کہانی اب ختم ہونے والی ہے۔

میں جانتا ہوں آپ کے دل کی بات کہ یہ خوب صورت المیہ ابھی ختم نہ ہو کیونکہ آپ بھی میری طرح دکھی ہیں۔ دکھ مشترک ہوں تو آدمی آدمی کو فوراً پہچان لیتا ہے۔

تن تارارا مر گئی اور میں زندہ ہوں اور اب میری شادی ہو رہی ہے۔

اس دنیا میں جو قطعی ممکن ہوتا ہے، وہ ناممکن ہو جاتا ہے اور جو ناممکن خیال کیا جاتا ہے وہ ممکن ہو جاتا ہے۔ جھوٹ کو حسن کی طرح پیش کیا جاتا ہے۔ کتابوں کا سچ اور ہوتا ہے۔ عملی زندگی کے سچ کی شکل بالکل دوسری ہوتی ہے۔ پیغمبر بہت بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے غیر فانی باتیں کہی ہیں۔ انہوں نے کروڑوں اربوں آدمیوں کو متاثر کیا ہے۔ انہوں نے سچائی کو محسوس کیا ہے اور اس کی تلقین کی ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ سچائی کا دور دورہ

نہیں ہوا۔

زندگی کا کوئی فلسفہ، کوئی نظریہ انسان کی سرشت کو نہ بدل سکا۔ جب دنیا غاروں میں رہتی تھی تو فساد فرد تک محدود تھا۔ جب وہ غاروں سے باہر آ گئے تو اجتماعی زندگی لپیٹ میں آ گئی۔

غار کا آدمی صرف جسمانی لحاظ سے ننگا تھا۔ کپڑے پہن کر وہ روحانی طور پر ننگا ہو گیا۔

غار کے آدمی کے بارے میں میں نے کتاب میں پڑھا ہے لیکن سوٹ میں ملبوس آدمی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں کتاب کی باتوں کو بھی مانتا ہوں مگر تجربے اور مشاہدے کی بات کو اس پر ترجیح دیتا ہوں۔

ماں کی بات بھی میں اس لئے مان گیا ہوں کہ ایک لحظہ کے لئے سہی، میں انہیں خوشی تو مہیا کر سکتا ہوں---- ورنہ میرے مرنے سے کسی کو کیا فائدہ ہو گا۔ مجھ سے پہلے بہت سے عاشق اپنی محبوباؤں کی خاطر مر چکے ہیں۔ ان کی موت سے کتنے انسانوں کے ضمیر جاگے؟

ہر محبت کرنے والا یہ بات جانتا ہے کہ محبت کھو کر زندہ رہنا مرنے سے زیادہ مشکل کام ہے اور پھر جینے مرنے کو اتنی اہمیت دینے کی بھی کیا ضرورت ہے---- روز لاکھوں کیڑے مکوڑے اور چرند پرند پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ لوہے کی ٹھوس مشینیں چل چل کر گھس جاتی ہیں اور ایک دن بے کار ہو جاتی ہیں۔ آدمی کے اعضا بھی ایک دن مضمحل ہو جاتے ہیں اور تنفس رک جاتا ہے۔

جہاز غرق ہو جاتے ہیں۔ زلزلے آتے ہیں، سینکڑوں لوگ لقمہء اجل ہو جاتے ہیں۔ قحط آتے ہیں، وبائیں آتی ہیں اور لاکھوں آدمی مر جاتے ہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔

جنگیں ہوتی ہیں۔ مشین گنیں انسانوں کی صفیں کی صفیں بھون کر رکھ دیتی ہیں، ایٹم بم گرتے ہیں، شہر کے شہر تباہ ہو جاتے ہیں۔ اور چشم زدن میں لاکھوں انسان صفحہء ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔

میں زندہ رہوں تو بھی زمین میرا بوجھ محسوس نہیں کرے گی۔ مر جاؤں گا تو بھی اس میں چونکا دینے والی کوئی بات نہیں ہو گی---- نظام کائنات میں کسی کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مکھیاں مچھر---- یہ سب کیا ہیں----؟ ان کے پیدا کرنے کا کیا جواز تھا----؟ سانپ، بچھو اور جونکیں پیدا کرنے میں کیا مصلحت تھی؟

اور آدمی----؟

آخر یہ زندگی ہے کیا چیز----؟

اگر اس میں روحانیت نہیں ہے اور محض مادے کی کارستانی ہے پھر تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے مگر قطعی ختم نہیں ہوتی۔

اگر روحانیت سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک جاندار دوسرے جاندار کو دق نہ کرے تو مادے پر یہ الزام کیوں لگایا جا سکتا ہے کہ وہ زندگی کے ساتھ شر بھی تخلیق کرتا ہے۔

مادے میں تو سرے سے کوئی جذبہ ہی نہیں ہوتا---- تو پھر یہ سانپ کے منہ میں زہر کی بوندیں کس نے رکھ دی ہیں؟ خالق، فساد پر راضی نہیں ہو سکتا مادہ جذبہ اور شعور نہیں رکھتا---- پھر----؟ پھر یہ زندگی کیا ہے----کیا ہے؟

پھل اپنا اپنا ذائقہ رکھتے ہیں۔ گیہوں کا بھی ایک مزاج ہے، ذائقہ ہے۔ ان کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ ان چیزوں کو استعمال کرنے والا بھی موجود

ہے۔ یہ شعوری فعل لگتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ دنیا سوچ سمجھ کر بنائی گئی ہے۔

عجیب گورکھ دھندا ہے۔

مادہ ذائقہ تو دے سکتا ہے' شعور اور جذبہ نہیں دے سکتا۔ خالق شعور اور جذبہ دے سکتا ہے' شر نہیں دے سکتا۔۔۔۔۔۔ اور یہاں یہ سب کچھ موجود ہے۔

عجیب بے تکی سی بات ہے۔۔۔۔ میں نے اتنے برسوں میں کیا کام کیا ہے' سوائے تن تارارا سے محبت کے۔۔۔۔ بس یہی ایک حادثہ ہے جسے میں نے پوری شدت سے محسوس کیا ہے اور یہیں سے میں نے زندگی کو بھی محسوس کیا ہے اور یہ احساس مجھے آگے بڑھا رہا ہے۔ اس سفر میں کچھ نا مانوس لوگ ملتے ہیں۔ میرا احساس انہیں قبول نہیں کرتا۔ وہ کچھ ایسے اصولوں اور قدروں کی بات کرتے ہیں جسے میرا ایمان تسلیم نہیں کرتا۔ وہ لوگ جو تلوار کے ذریعے ناموری حاصل نہ کر سکے اپنی دماغی کاوشوں سے قدریں بنا کر چھوڑ گئے۔

یہ سب شعوری اختراعیں ہیں اور گھٹے ہوئے ذہن کا رد عمل۔

سچائی وہ نہیں ہوتی جو عقل کے واسطے سے پہچانی جائے۔ وہ تو پلک جھپکتے میں دل میں کپکپی اور روح میں گدگدی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ بجلی کے لپکے کی طرح وجدان میں اترتی ہے اور اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے۔

میں نے زندگی کو بالکل اس انداز میں محسوس کیا ہے۔ اس احساس نے کتابیں پڑھ کر جنم نہیں لیا۔۔۔۔ یہ میرا اپنا تجربہ ہے۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔۔۔ میری روح کا احساس ہے۔۔۔ یہ جھوٹ نہیں ہے۔۔۔ یہ غلط نہیں ہو سکتا۔۔۔ یہ مفروضہ نہیں ہے۔

میں اسی بنیاد پر زندگی کا پیچھا کروں گا۔۔۔ اس کا کھوج لگاؤں گا۔

اے زندگی۔۔۔۔۔ تو لاکھ مصنوعی سچائیوں کے ریشمی غلاف میں لپٹی ہوئی سہی مگر میں تجھے چھو لوں گا۔ میرا شعور تجھے نہ پا سکے گا' میرا احساس تجھے ڈھونڈ لے گا۔

وہ چھوٹے چھوٹے انسانی جذبے' وہ سادہ سادہ سچائیاں۔ میرا وجدان تجھے انہی جذبوں سے محسوس کرتا ہے۔

اے زندگی! تو کائنات کا جزو سہی۔ تیری خو شر سہی۔ تیری فطرت کی حقیقت کو میں تسلیم کرتا ہوں۔ تیرے خمیر کی ننانوے فی صدی کدورتوں اور نفرتوں کے باوجود میں تیرا سامنا کروں گا۔۔۔ اصلاح کا بیڑا اٹھانے کے لئے نہیں۔۔۔۔ اس ایک فی صد سچ کی خاطر جو تیرے دامن میں مخفی ہے۔

تیری نفرتوں اور کدورتوں کی حفاظت کے لئے خط استوا کی حد بندی کافی ہے۔ رنگ و نسل کی تفریق موجود ہے۔ زبان اور مذہب کے امتیاز کا دعویٰ بھی یہ کام کرتا رہے گا۔ لیکن وہ جو انسانی جذبے ہیں۔۔۔۔۔ وہ ایک فی صد سچائیاں۔۔۔۔ میں نے ریاضی دان کی طرح ان کا حساب لگایا ہے۔ انہیں محسوس کیا ہے۔

میں ان کی خاطر تیرا ساتھ دوں گا۔ تیرا پیچھا کروں گا۔ تجھے تلاش کروں گا۔ تجھے پکڑوں گا۔ تجھے پاؤں گا۔

راہ میں اتاسا اور کمل رام کی طرح لوگ مجھے ملتے رہیں گے۔ پلک جھپکتے میں سچائی کو پہچاننے والے دو چار آدمی مل جائیں تو یہ زندگی گراں نہیں ہو سکتی۔ زندگی کتنے ہی دکھ ڈھیر کر دے۔۔۔ سینے میں نیکی کی امنگ موجود ہو تو انسان کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔

جینا عذاب نہیں، فرض ہے---- شعور کا بس یہی احسان کافی ہے کہ اس نے زندہ رہنے کا یہ ادراک دے دیا ہے۔

